U.5473 H   [illegible] - 12 - 09

Title - KHUTBA - E - SADARAT C - O - HASHTUM IJLAS INDIAN NATIONAL CONGRESS MUNAQAD KO CANADA 26 DECEMBER 1923.

Creator - Mohd. Ali Johar.

Publisher - Matba Jamia Millia Aligarh (Aligarh).

Date - 1923

Pages - 148

Subject - Mohd. Ali - Sawanch-o-Tanqeed; Khutbaat-o-Taqareer - Mohd. Ali Johar; Mohd. Ali - Khutbaat; Indian National

اللہ اکبر

خطبۂ صدارت

مولانا محمد علی بی۔اے (الہ آباد و آکسفورڈ)

سی و ہشتم اجلاس انڈین نیشنل کانگریس

منعقدہ

کوکاناڈا - ۲۶ دسمبر ۱۹۲۳ء
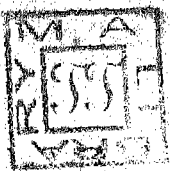
مطبع جامعہ ملیہ علی گڑھ میں طبع ہوا

معذرت

اُردو ایڈریس بہت ہی قلیل مدت یعنی صرف تین چار روز میں چھپا ہے۔ مختلف کاتبوں کی وجہ سے خط مختلف ہوگئے ہیں اور نمبروں میں غلطی ہوگئی ہے۔ جس کو ناظرین کرام معاف فرمائینگے وہ صفحات حسب ذیل اندراج کے مطابق شمار ہونگے :-

(۱) صفحہ ۱۶۰ کے بعد صفحات از ۱۳۹ لغایۃ ۱۴۶ کے بجائے ۱۶۱ لغایۃ ۱۶۸ شمار ہونگے۔

(۲) ۱۱۰ ج کے بعد ۱۱۱ شمار ہونگے۔

(۳) ۱۲۰ کے بعد ۱۲۳ شمار ہونگے۔

(۴) ۱۳۸ کے بعد ۱۴۷ و ۱۴۸ کی بجائے ۱۳۹ و ۱۴۰ شمار ہونگے۔

مہتمم مطبع جامعہ ملیہ علیگڑھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا غالب الا اللہ

حضرات!

انڈین نیشنل کانگریس کے ہر صدر نشین کے لئے ایک دستور چلا آتا ہے کہ وہ ارکان کانگریس کی اُس عزّت افزائی پر شکریہ ادا کرے جو ملک و قوم کی جانب سے انتہائی عزّت ہوسکتی ہے۔ یہ بھی دستور ہے کہ ہر جدید صدر اپنی نااہلی اور اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں اپنی کم مائگی کا اظہار کرے۔ اسمیں قطعی شبہ نہیں کہ اُن حضرات کے خلقی انکسار نے اُن کے اس اظہار میں وہ خلوص پیدا کر دیا ہے جو کسی طرح تکلف و تصنع پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اگر میں اپنے متعلق بھی اُسی قسم کا اظہار کروں تو اُسکا باعث اصلی میرا خلقی انکسار نہ ہوگا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دو سال ہوئے کہ جب میری گرفتاری سے کچھ ہی قبل بعض صوبوں نے صدارت کانگریس کے لئے میرا نام پیش کر کے میری عزّت افزائی فرمائی تھی تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی اور مجھے موقعہ حاصل تھا کہ اپنا نام واپس لے کر اپنی حیرت کا کچھ تو اظہار کر دیتا۔ چنانچہ میں نے یہی کیا لیکن اِس مرتبہ یہ موقعہ نکل چکا تھا اور معاملہ میرے اختیار سے بالکل باہر تھا۔ کیونکہ جب میں قید فرنگ سے آزاد ہوا تو معاً اُس کے بعد ہی آپ کی مجلس استقبالیہ کی جانب سے مجھے یہ تار پہنچا کہ چند روز میں مجلس کا ایک جلسہ صوبہ کانگریس کمیٹیوں کے انتخاب پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کرنے کے لئے منعقد ہونے والا ہے یقین فرمائیے کہ وہ اسباب جو دہلی میں اجلاس خاص

کے داعی و محرک ہوئے اور اُن سے بھی زیادہ خود دورانِ اجلاس میں پیش آنے والے واقعات اگر مجھ پر اُن باتوں کا انکشاف نہ کردیتے جن کے ہوتے ہوئے میرا اپنے نام کو واپس لینا خدمتِ قوم سے اعراض کرنے کے مرادف ہی تھا میں اسوقت باوجود تاخیر ہونے کے اپنا نام واپس ہی لے لیتا کیونکہ آپ کو یاد ہوگا کہ انڈین نیشنل کانگریس سے میرا تعلق حال ہی کا ہے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ میں کانگریس میں پہلی مرتبہ ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور اُس وقت بھی میری شرکت معمولی ضابطے کے مطابق نہ تھی۔ آپ میں سے اکثر حضرات کو یاد ہوگا کہ ہم دونوں بھائی اُسی وقت بیتول جیل سے جنگ کے آخری چار سال کی مدتِ نظر بندی اور اخیر میں قید جھیلنے کے بعد آزاد ہوکر آئے تھے۔ رہائی کے بعد ہم سیدھے کانگریس پہونچے جس کا اجلاس شہادت گاہ امرتسر میں ہورہا تھا اور چونکہ ہم باضابطہ ڈیلیگیٹ منتخب نہیں ہوسکے تھے لہذا مہمان نواز امرتسر نے فوراً ہمیں اپنا بنا لیا۔ دوسرے سال ناگپور میں جو اجلاس منعقد ہوا صرف وہی ایسا تھا جسمیں ہم دونوں بھائی باقاعدہ منتخب ہوکر ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک کانگریس ہوئے۔ ابتک اِس کرسیِ صدارت کو وہی بزرگ زینت دیتے رہے ہیں جو کانگریس کی خدمت میں عمریں صرف اور بال سفید کر چکے تھے۔ تو ایسی صورت میں کیا ایک ایسے شخص کا جو کانگریسی ہونے کے اعتبار سے بھی کل کا بچہ ہو آپ کے غیر معمولی اعزاز کے لئے شکریہ ادا کرنا محض رسمی قرار دیا جاسکتا ہے؟

صرف ایک خیال جسکی بنا پر آپکی یہ عنایت حق بجانب ہوسکتی ہے یہ ہے کہ کانگریس سے میرا تعلق اگرچہ جدید ہو لیکن ایک ایسی محترم ہستی سے نسبت حاصل ہے جسکا شمار باوجود جدید ترین کانگریسی ہونے کے عظیم ترین کانگریسیوں میں ہے اور بجا ہے۔ اور جیسے آج ہر شخص کی نگاہیں اِس پنڈال میں ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئی ہیں جیسے میں نے بحیثیت ڈیلیگیٹ ۱۹۱۹ء میں کانگریس کی شرکت کی اُسی کی واحد شخصیت سب پر غالب دیکھی لیکن سب سے زیادہ آج کے دن ہمیں اپنے سردار مہاتما گاندھی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ اُسکی جگہ پر اُس کا ادنیٰ متبع جسکی عقیدت و محبت ادنیٰ نہیں تصفیہ مسائل میں آپکا ہاتھ بٹائے تو یقین فرمائیے کہ میں اپنا دل نہیں

جذبات سے لبریز پاتا ہوں جو اُس عرب شاعر کے دل میں موجود تھے جسکا مقولہ ہے۔

کَبَّرَنِی مَوْتُ الْکُبَرَاءِ (بزرگوں کی موت نے ہم کو بزرگ بنا دیا)

باوجود اس کے کہ اُس شخص کو جو مہاتما گاندھی کی اسیری کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے۔ یہ امید تھی کہ بزعم خود انھیں زندہ دفن کر کے وہ اُس روح کو فنا کر دیگا جسے مہاتما نے قوم میں پیدا کیا تھا میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ رُوح آج بھی اُسی طرح زندہ ہے جسطرح خود مہاتما زندہ ہیں خدا تعالیٰ کی اعانت اور آپکی عنایت کی بجا توقع کر کے میں آج اُسی رُوح کو باقی رکھنے کی آپکو دعوت دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میں بالکل ہی اُس جلیل القدر منصب کے جس کے لئے آپکی کرمفرما نظرِ انتخاب نے مجھے موزوں سمجھا نا اہل ثابت نہ ہوں گا۔

حضرات! جو شخص آپکی رہنمائی کرسکتا ہے وہ وہی ہے جو آپ کی رہنمائی امرتسر میں کلکتہ میں ناگپور میں اور احمد آباد میں کرچکا ہے باوجودیکہ کانگریس کے اجلاس میں ہر جگہہ کانگریس کا اپنا منتخب شدہ صدر موجود ہوتا تھا۔ ہمارا سپہ سالار آج دشمن کے ہاتھ میں اسیر جنگ ہے اور اُسکی عدم موجودگی سے جو جگہہ خالی ہوئی ہے اُسکو کوئی بھر نہیں سکتا۔ رہا میرا معاملہ تو میری حیثیت آپ ہی جیسے ایک سپاہی سے زیادہ نہیں جسے آپکی عنایت نے صف سے باہر نکال لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپکی یہ عنایت نہ صرف اس اجلاس کے مباحث ہی میں بلکہ پورے سال بھر مبذول رہیگی جبھیں آپکے قانون کی رُو سے بحیثیتِ صدر آپکا ہاتھ بٹانے کی ذمہ مجھ پر عاید ہوتی ہے۔

صدر کانگریس کا کارِ منصبی

ایک امر میں آپکو بھی حق ہے کہ میرے متعلق اطمینان حاصل کرلیں اور میں اس کے متعلق بلا تامل آپکو اطمینان دلانے کو موجود ہوں میں عمر بھر لڑتا رہا ہوں اور لڑنا بھی کیسا جو اپنے پورے کس بل کے ساتھ بھپر بھپر کر لڑتا رہا ہے لیکن صدر منتخب کر کے آپ نے مجھے میری طبعی آزادی سے محروم کر دیا ہے۔ اور اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم صرف اس آزادی کو واپس ہی لینے کے لئے میں بڑی خوشی سے اس موقع کے اعزازِ صدارت سے دست بردار ہوگیا ہوتا لیکن اس حیثیت میں

آپ نے مجھے ثالث بالخیر بنا دیا ہے۔ اور مجھ جیسے جنگجو تک کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر جنگ سے بہتر کوئی چیز ہے تو وہ صلح ہی ہے۔ والصلح خیر۔ لہذا میں بھی صلح و اتفاق کے قیام میں مدد دینے کی خاطر جنگجوئی سے دست بردار ہوتا ہوں اور اسکا مجھے مطلق افسوس نہیں۔ بحیثیت صدر جہاں تک میرے دائرہ امکان میں ہے مجھے آپکی خدمت کرنی ہے نہ کہ حکومت۔ اور آپکی جیسی سیاسی جماعتوں کے ضوابط کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے اس اجلاس کا افتتاح ایک خطبہ سے کرنا ہے لیکن اس فرض کو یقیناً میں آپکے ایک خادم کی حیثیت سے انجام دے رہا ہوں نہ کہ ایک حاکم کی حیثیت سے۔ مختلف مسائل کے فیصلے کرنے میں جو آپکے تصفیہ کے لیے پیش ہوں گے میں آپکو مدد دینے کے لئے حاضر ہوں اور جس حد تک کہ آپکے ایک رفیق کار اور ہمدرد کے اختیار میں ہے میں امید کرتا ہوں کہ میں آپکی ایسی مدد کر سکوں گا جس سے آپ صائب اور صحیح نتائج ہی مترتب کر سکیں اور ایسے نتائج وقت کو خراب، مزاج کو تلخ اور قوت کو ضایع کئے بغیر مترتب ہوں لیکن یہ فیصلے آپ ہی کے ہونگے نہ کہ میرے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ صحیح معنی میں ہم سب کے متفقہ فیصلے ہوں گے۔ میں نے اوپر کہیں مہاتما جی کی ہمہ گیر شخصیت کا ذکر کیا ہے اور ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مہاتما کے اثر کو زائل کرنا اُن ہمخیال افراد کے لئے بھی جنھوں نے اس اثر کو زائل کرنا چاہا۔ کسقدر دشوار تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی نے نہ تو کبھی کسی سے کہا اور نہ چاہا کہ کوئی اپنی قوت فیصلہ اُن کے تابع کر دے اور میں نے یہ سنا ہے کہ اپنی گرفتاری سے کچھ ہی روز پیشتر مہاتما جی نے بہ کمال تاسف یہ محسوس کیا کہ اُن کے متبعین اور مداحین میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اگرچہ بہ رضا و رغبت اور بہ کمال خلوص اُن کے ساتھ کامل اتفاق رائے کا اظہار کیا تھا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ محض مہاتما کی شخصیت کا اتباع قبول کر رہے ہیں اور اپنے اذعان و یقین کی قوت کے بھروسہ پر مہاتما کی تدبیر کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔

میرے لئے یہ کہنا بھی داخل گستاخی ہے کہ میرا اتنا اثر نہیں جتنا اثر بلاشک و شبہ اہل ملک کے قلوب پر مہاتما جی کا تھا اور میں چاہتا ہوں کہ ہر رائے خواہ وہ کسی طرف دیجائے۔ رائے دہندہ کے ذاتی اور بعد غور کامل فیصلہ کا نتیجہ ہو اور اُس رائے کی پوری ذمہ داری انفرادی طور پر رائے دہندہ پر عاید ہوتی

ہو۔ اپنے متعلق میں کہتا ہوں کہ اگر میں کسی اہم معاملہ میں اپنی رائے محض اس خوف سے ظاہر نہ کروں کہ شاید وہ آپ کی نظر میں قابلِ قبول نہ ہوگی۔ تو میں یقیناً ادائے خدمت میں قاصر رہوں گا۔ اور پھر میرا یہ فعل حقیقی جمہوریت کے مطابق بھی نہ ہوگا لیکن اگر صرف صدر کی خوشنودی کے لئے کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کو آزادی نہ دی گئی یا بعض کی دلجوئی کے لئے اکثر کو خاموش کر دیا گیا تو یہ جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کے ساتھ محض مذاق و تمسخر ہے۔

کانگریس کا اجلاس رائے شماری کا جلسہ نہیں

بہرکیف ہمیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ملک نے چھ ہزار ڈیلیگیٹوں کو اس لئے نہیں منتخب کیا ہے۔ اور ہم سب کے سب ملک کے ہر گوشہ سے چل کر اس طرح کوکینیڈا نہیں آئے ہیں جیسے رائے شماری کے جلسوں میں آتے ہیں کہ صرف اپنے ووٹ دیدیں اور اپنے انفرادی فیصلے جو روانگی سفر سے قبل سوچ چکے تھے پیش کر دیں۔ بھلا ہم اپنی ذات کے لئے اور نیز دوسروں کے لئے کیا نفع پہونچا سکتے ہیں اگر بقول ایران کے خیمہ دوز شاعر کے اسی دروازے سے باہر آ گئے جس سے داخل ہوئے تھے۔ اگر ہم اپنے سفر کو بے سود اور اپنی محنتوں کو رائگاں نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی اپنی رایوں کو خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اپنے دوسرے ڈیلیگیٹ بھائیوں کی رایوں سے مقابلہ دموازنہ کر کے اور اُن سے اثر لیکر یہاں اچھی طرح جانچ پڑتال کریں اور اس میں کوئی شرم نہیں بلکہ بسا اوقات یہ ہمارے لئے قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے سے زیادہ تجربہ کار اور قابل لوگوں کے فیصلے اور کثرت آرا کے مجموعی وزن سے متاثر ہو کر اپنی رائے میں تبدیلی کریں اگرچہ وہ افراد بحیثیت افراد ہم سے بہتر نہ ہوں اور گو ہمیں اپنی رائے کے عدم صحت کا اسوقت بھی پورا یقین نہ ہو۔ میں دوسروں کے معتقدات کی عزت کرنے میں کسی سے کم نہیں لیکن معتقدات ہر موقعہ پر ضمیر کے معاملات نہیں ہوا کرتے اور میرے اس خیال کی تائید میں تاریخ کے ایک بڑے پختہ ضمیر مدبر یعنی کرامویل کی مثال موجود ہے جو اپنے رفقا سے یہ کہا کرتا تھا۔ ”یاد رکھو تم سے بھی غلطی کا امکان ہے!!“

ضبطِ نفس اور تطبیقِ آرا

ہر ڈیلیگیٹ کو حق حاصل ہے کہ پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرے اور ایسا اظہار رائے
جتنے مسائل پر چاہے کرے۔ اسے یہ بھی حق ہے کہ خود جتنی تجویزیں چاہے پیش کرے اور دوسروں کی
تجویزوں کی جیسی چاہے ترمیں کرے اور جتنی مرتبہ چاہے رائیں شمار کرائے۔ لیکن ان حقوق کی استعمال
میں اگر دوسروں کی رائے اور سہولت اور مصیبت زدہ و درماندہ قوم کے بہترین مفاد کا کما حقہٗ
خیال نہ کیا گیا تو کوئی کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے بڑے سردار (مہاتما گاندھی) اکثر افسوس کیا کرتے
تھے کہ ہمارے مجامع میں جو قومی جوش کا اظہار ہوتا ہے اُن میں ضبطِ نفس اور پابندیِ ضابطہ مفقود ہے
اور حقیقتاً یہ ہمارے بھائیوں کی طبعی امن پسندی کا اور نیک مزاجی ہی ہے جو ایسا اوقات ناخوشگوار
واقعات سے ہمارے مجامع کو بچاتی رہی ہے۔ ضبطِ نفس اور پابندیِ ضابطہ کی تعلیم اراکین کانگریس
جیسے رہنمایانِ ملک ہی دے سکتے ہیں۔ اور خود حضراتِ ڈیلی گیٹ کا ضبطِ نفس اور پابندیِ ضابطہ
عوام کے ضبطِ نفس اور پابندیِ ضابطہ کی سب سے بڑی ضمانت ہے لیکن سب سے زیادہ جس امر کو ملحوظ
رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ گو ہم اپنے خیالات کو زوردار سے زوردار الفاظ میں ظاہر کریں لیکن اُن
کے اظہار کے وقت ایسی فرقہ بندی سے بچتے رہیں جس کی بنیاد ذاتی خصومت پر ہو اور جس کا انجام بدزبانی و
طعن و تشنیع پر ہو۔ ہمارے سردار اپنے عدم تشدد کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں پس جس عدم تشدد
کا ہم اسقدر بلند آہنگی سے دعویٰ کرتے ہیں اگر ہم اُس کے برکات سے اپنے بہترین دوستوں ہی کو محروم
رکھیں تو یہ امر اُس شخص کے ساتھ ہماری عقیدت و وفاداری کی ایک عجیب و غریب تشریح و تفسیر
ہوگی جو خیالات و الفاظ تک میں دشمن پر تشدد جائز نہیں رکھتا۔

میں کسی صورت میں بھی عام جوش و سرگرمی کو سکون و سکوت یا بے توجہی و بے پروائی سے بدلنے
کو طیار نہیں ہمیں ضبط و نظم کی ضرورت ہے نہ کہ موت کی۔ قومی مشین کے چلنے کے لئے ضرورت کے
مطابق اسٹیم کا ہونا لازمی ہے لیکن اسے قابو میں رکھنا بھی شرط ہے۔ اسی کے ایک بھاگ سمجھوتے اور
اپنے شرکاء کار کے لئے اپنی جماعتوں میں گنجائش نکال لینے کے اصول بھی ہیں۔ ہماری ساری جنگ آزادی

اصول کی جنگ ہے اور اصول کو تو ہم امن تک کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے لیکن ترک اصول سے محترز رہنے کے بعد قوم کی موجودہ حالت کے تقاضے سے ہم ہر قربانی کرنے پر مجبور ہیں تاکہ ہم اُن لوگوں کو بھی اپنا رفیقِ سفر بنا سکیں جو ہماری ہی طرح قوم پرست تو ہیں لیکن ہر معاملہ میں ہماری رائے سے اتفاق نہیں رکھتے ۔ ہماری سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے سردار نے سیاسیات کو روحانیات کے قالب میں بدل دیا ہے اور ہم اب ایسی سیاست پر ہرگز قانع نہیں رہ سکتے جو اخلاقیات سے لاتعلق ہو۔ سیاسی امور میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں بہترین چیز کے حصول میں کامیابی نہیں ہوتی اور مجبوری اس سے کمتر درجہ کی چیز ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی خود نام ہے دوسرے نمبر کی چیزوں کے ایک نامتناہی سلسلے کا۔ اگر ہم بجائے بہترین شے حاصل کرنے کے اُس سے اُتری ہوئی کوئی چیز قبول کرنے سے قوم کی کثیر جماعتوں کو اپنے ساتھ فتح و کامرانی کی شاہراہ پر چلا سکیں تو ہمیں اُس اُتری ہوئی چیز کے قبول کرنے سے کوئی شے بھی مانع نہیں ہونی چاہئے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم کو جماعتی فتح حاصل کرنے کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہئے۔ درآں حالیکہ ہمیں غلامی کے مقابلہ میں آزادی کی اور پوری قوم پر مظالم کے مقابلے میں عدل و انصاف کی فتح عظیم حاصل کرنی ہے۔ میرے دوستو! مجھے معاف کیجئے کہ میں نے پند و نصائح کا دفتر کھول دیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا آپ کی اور اپنی دونوں کی حالت کے اعتبار سے میرا ایسا کرنا ضروری تھا۔ حالا آمدم بر سرِ مطلب۔

مسلمان اور کانگریس

مسلمانوں پر واقعہ سنہ ۵۷ء کے اثرات

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ میرا تعلق کانگریس سے بہت قلیل عرصے کا ہے لیکن میرا یہ اعتراف محض شخصی ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کی پوری سیاسی تاریخ پر محتوی ہے اور اگر میں اُس کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کے روبرو پیش کروں تو یہ محض اُس مسئلے کی توضیح کے خیال سے ہوگا جو آج ہمارے تمام مسائل سے زیادہ

اہم اور محتاج وضاحت ہے۔ ۱۸۸۵ء میں جب بعض ہندوستانی ارباب حل وعقد نے اپنے انگریز ہمدردوں کی اعانت سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنا ڈالی تو مسلمانانِ ہند باستثناء معدودے چند اس تحریک کی شرکت سے محترز رہے۔ اوّل تو مغربی تعلیم کی کمی کے باعث وہ ایسی تحریک میں شرکت وشمول کے اہل ہی نہ تھے جو خالصتاً مغربی طرز پر تعلیم یافتہ جماعتوں کی پیدا کردہ تھی۔ اس کے علاوہ اُن کے اسوقت کے مزاج سیاسی نے انھیں ایسا عنصر بنا دیا تھا جسکی موجودگی کسی سیاسی تحریک کے لئے خطرناک ہو سکتی تھی۔ وہ ہندوستان کی حکومت تو کھو چکے تھے لیکن اُس حکومت کی بو اُن کے دماغوں میں باقی اور اُس کی روایات اُن کے دلوں میں ہنوز محفوظ تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ طرز جدید کی تعلیم سے اُنھیں جو تنفر پہلے ہی سے تھا اُس میں اور بھی شدت ہو گئی۔ جنگ پلاسی اور واقعہ ۱۸۵۷ء کی درمیانی مدت صد سالہ میں آہستہ اور غیر محسوس تدریج کے ساتھ ہندوستان کی عنانِ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی لیکن مسلمان اِن نئے حکمرانوں کو تہذیب وتمدن میں اپنے سے فروتر ہی سمجھتے رہے۔ نفرت و ناراضی کے یہ بادل ایک صدی تک جمع ہوتے رہے۔ تا آنکہ ۱۸۵۷ء میں یہ طوفان ٹوٹ پڑا۔ اسکی ابتداء کلکتہ کے قریب دیسی فوج میں ایک معمولی فساد کی حیثیت سے ہوئی لیکن دہلی اور نیز میرے اپنے صوبے میں جہاں انگریزوں کے رہنے نہ رہنے کا سوال درپیش تھا مختلف تکالیف وشکایات نے پیدا ہو کر سیاسیات کو مذہبی رنگ دیدیا تھا۔ اگرچہ بہت سے مسلمانوں نے خطراتِ عظیمہ کا مقابلہ کر کے انگریزوں کی ایسے وقت میں مدد کی جب کوئی شخص مشکل سے اُن کی کامیابی کی پیشین گوئی کر سکتا تھا۔ تاہم اسکی پاداش میں سب سے زیادہ مصائب اُن مقامات کے مسلمان امراہی کو برداشت کرنے پڑے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مظالم و مصائب سے بھی زیادہ بلحاظ اپنے مستقل نتائج کے واقعہ ۱۸۵۷ء بلا مبالغہ انقلاب فرانس کی اُس معاشرتی زلزلے سے تشبیہ دیا جاسکتا ہے جسکے بعد فرانس کے قدیم طبقۂ امرا میں سے بہت سی عائلیں ساقط ہو گئے۔ مسلمان امرا میں سے جو بچے کھچے رہ گئے تھے وہ اپنے اثر سے بالکل اور اپنے مقبوضات کے زائد حصے سے محروم ہو چکے تھے اور انھیں اسلامی حکومت کے واپس آنے کی قطعی کوئی امید نہ رہی تھی۔ تاہم مسلمانوں کی ایک پوری نسل ہندوستان کے اُن نئے حکمرانوں کی تہذیب وتمدن سے جیسے

وہ اب بھی حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی یکسر بے تعلق رہی ۔مسلمان ان یونیورسٹیوں کی تعلیم سے جو اُسی سال کلکتہ بمبئی اور مدراس میں قائم ہوئیں جس میں سنہ ۵۷ نے اسلامی ہند کے سیاسی مرکزوں کو تہ و بالا کر ڈالا تھا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے ۔مسلمانوں کے اس طرز عمل کا (جو اپنے گھروں میں منہ پھیلائے بیٹھے تھے) بدیہی نتیجہ تھا کہ جب تقریباً ۳۰ سال بعد ہندوستانیوں کی ایک نئی نسل نے جو انگریزوں سے استفادۂ علم کر چکی تھی مغربی طرز پر ایک سیاسی تحریک شروع کی تو اسوقت ہندوستانی مسلمان اس قسم کی تعلیم نہ ہونیکے باعث اس تحریک میں کوئی حصہ لینے کے قطعاً ناقابل ہوئے تاہم کانگریس نے جو اپنے آپ کو "ہندوستانی" اور "قومی" کے نام سے موسوم کرتی تھی مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت کو محسوس کیا کیونکہ اس کے بغیر وہ اپنے اس نام کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتی تھی

سر سید احمدؒ خاں کی طرف سے مسلمانوں کی شرکت کانگریس کی مخالفت

چنانچہ شروع ہی سے مسلمانوں کو ڈیلیگیٹ بنانیکی کوششیں کی گئیں لیکن عین اس موقع پر سر سید احمد خاں نے جو مسلمانان ہند میں تعلیم مغربی کے محرک اعظم ہیں سیاسی میدان میں قدم رکھا اور دو تاریخی تقریروں کے ذریعہ سے جن میں سے ایک ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کو لکھنؤ میں اور دوسری ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو میرٹھ میں ہوئی انھوں نے سیاسی جد و جہد کی ان کارروائیوں کو بھی یک قلم رد کر دیا جو مسلمانوں کی طرف سے تحریک کانگریس کی تائید میں ظاہر ہونی شروع ہوئی تھیں ان تقریروں پر اعتراض کرنا کچھ مشکل نہیں کیونکہ ان میں بہت سے ایسے منطقی مغالطے ہیں جنکی تائید آج کوئی بھی سیاسی دماغ رکھنے والا مسلمان نہیں کر سکتا لیکن میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو سید احمد خاں کو محض اس بنا پر ہندو مسلم اتحاد کا مخالف سمجھوں کہ ان تقریروں میں بعض نامناسب فقرے ان کی زبان سے ادا ہو گئے تھے ۔جو ان جیسے جنگجو مناظر کی خصوصیات میں سے تھے۔

مخالفت کی حقیقی وجہ و نوعیت

اگرچہ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سید احمد خاں کی پبلک زندگی اپنی قوم کے ترقی کے مساعی ہی میں صرف ہوئی تاہم وہ ویسے ہی اچھے ہندوستانی رہے جیسے مسلمان تھے ان کی بہت سی تقریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے سرگرم محب وطن تھے ۔ اور ان کا سینہ اتحاد ہند کے جذبہ محبت سے لبریز تھا۔ جو لوگ اُن سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اکثر ہندؤں سے ان کی کیسی گہری دوستی تھی جو اس تعصب کی موجودگی میں قطعی ناممکن تھی جسکا بعض وقت ان پر الزام لگایا جاتا ہی ۔

یہ الزام بھی کسیطرح صحیح نہیں کہ وہ ہر زمانے کے لیے مسلمانوں کے سیاسیات میں حصہ لینے کے خلاف تھے اپنی اُن دو تقریروں میں جن کا میں نے ذکر کیا ۔ انھوں نے جو کچھ دلائل بھی پیش کیے ہوں اُن سے قطع نظر کر کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے وہ صرف دو ہی دلیلیں پیش کرتے تھے جن کی بنا پر بظاہر خود سید احمد خاں کو بھی یقین تھا کہ اُس وقت مسلمانوں کی شرکت کانگریس قطعی نامناسب تھی وہ اس امر کا اچھی طرح اندازہ کرتے تھے کہ اُن کے زمانے کے مسلمانوں کی طبعیت و مزاج کو اس سے زیادہ کوئی شغل و فعل نہ تھا کہ وہ اپنے برطانوی غاصبین حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں اور وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ یہ فعل جیسا آسان تھا ویسا ہی آخر کار کانگریس جیسی امن پسند سیاسی تحریک کی بقا و ترقی کے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہو گا ۔ یہ پہلی دلیل تھی جس نے سید احمد خاں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی قوم کو سیاسیات میں خاص حدود سے آگے نہ بڑھنے دیں دوسری دلیل بھی کچھ کم مضبوط نہ تھی انکی رائے یہ تھی کہ مسلمان اگر اپنی ترقی چاہتے ہیں تو انھیں سب سے پہلے اشاعت تعلیم میں کوشش کرنی چاہیے

اور مغربی تعلیم کے حصول کے لیے مسلمانوں کو راضی کر لینا آسان نہ تھا خواہ اپنی
اس درس گاہ میں ہی کیوں نہ ہو جس میں بہ خلاف سرکاری اسکولوں اور کالجوں
کے مذہبی تعلیم بھی دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔
مسلمانوں کے لیے یہ آسان تر تھا کہ قابل نفرت حکومت کافرہ کی تخریبی
نکتہ چینی کے مزے لیتے رہیں بہ مقابلہ اس کے کہ ماہرین تعلیم کے خشک و
بے مزہ تعمیری پروگرام سے دلچسپی لیں۔ لہذا سید احمد خاں نے اپنی تمام
تر توجہ اس پر صرف کر دی کہ مسلمانوں کے مساعی کو سیاسی راستے کی
طرف رُخ کرنے سے روکیں جو زیادہ دلکش لیکن ساتھ ہی اس کے کم سود مند
تھا۔

پچھلی نسل کے اعمال و افعال پر نظر ڈالتے ہوئے آج جبکہ وقوع واقعہ کے
بعد عقلمند بننا زیادہ آسان ہے۔ سید احمد خاں کا یہ طرز عمل میری رائے
میں نہایت دانشمندی پر مبنی تھا۔ اور اگرچہ میرا جی چاہتا ہے کہ بعض باتیں جو
ان کی زبان سے نکل گئیں کاش کہ وہ نہ کہتے۔ تاہم میں اس اعتراف پر مجبور ہوں
کہ مسلمانوں کا بہ حیثیت مجموعی ہندوستان کا کوئی خیر طلب مسلمانان ہند کی
رہنمائی کے لیے بجز اس کے اور کوئی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا تھا۔
لہذا یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس شخص نے مسلمانوں کا مفاد اسی میں سمجھا
کہ وہ نظر بہ حالات موجودہ کانگریس سے علیحدہ رہیں۔ وہ شخص مسلمانوں کے
حصہ غالب کا محبوب نہ تھا۔ سید احمد خاں چونکہ تعلیمات قرآنی کی تفسیر عقل انسانی
کے مطابق کرتے اور ان عام پسند وہمیات کے شدت سے مخالف تھے جو
راسخ العقیدہ مسلمانوں میں مسلمات مذہبی سمجھی جاتی تھیں اور نیز ان رسوم و روایات کی
بیخ کنی میں مصروف رہے جو "ٹھیٹ اسلام" کی نظر میں تو مستند نہ تھیں مگر جنہیں

مرورِ ایام نے مذہبی شان دے رکھی تھی۔ اسی لیے انہیں ملحد و کافر قرار دیا گیا۔ کٹر پکا مسلمان انھیں سخت سست کہتے بلکہ سب و شتم کرتے اور مدت دراز تک اُس کالج کو جو انھوں نے علیگڈھ میں قائم کیا تھا ہوا سمجھتے رہے۔ لیکن حیرت کی کوئی انتہا نہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود الزام کفر و الحاد اور باوجود شدت سب و شتم، سیاسی پالیسی میں ساری قوم کی قوم نے بے چون و چرا اسی شخص کی پیروی کی ظاہر ہے کہ کسی منطقی مغالطے یا سیاسی سبز باغ میں اتنی قوت نہیں ہو سکتی اور میرا یقین واثق ہے کہ سید احمد خاں کو اس میں محض اس وجہ سے کامیابی ہوئی کہ اُن کی سیاسی رائے صائب تھی،

لہذا تقریباً ۲۰ سال تک نہ مسلمانوں نے سیاسیات میں حصہ لیا اور نہ اُن کے پاس کوئی قابل ذکر سیاسی انجمن تھی۔ اہم مواقع پر جب سید احمد خاں اور اُن کے سرکاری معاونین دیکھتے تھے کہ کانگریس کے کسی خاص مطالبہ کے منظور ہو جانے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا تو وہ اور ان کے دوست جن میں سے اکثر کالج کے ٹرسٹی ہوتے تھے اس انجمن کا جلسہ کر لیتے تھے جس کا نام "انجمن حفاظت مسلمین" یا اسی قسم کا کوئی دوسرا ہوتا تھا اور جس کی تجاویز "پانیر" اور سید احمد خاں کے خاص ہفتہ وار اخبار میں شائع ہو جاتی تھیں۔ بس یہی کام تھا جو اس زمانے میں مسلمان میدان سیاست میں کیا کرتے تھے۔

میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ سید احمد خاں کو اچھی طرح علم تھا کہ ان کی یہ پالیسی ان کے سرکاری دوستوں کو بہت پسند تھی اور اگر وہ کسی ایسی دوسری پالیسی کے اختیار کرنے کا ارادہ کرتے جو اُن کے سرکاری معاونین کو پسند نہ ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ معاونین اُن کے کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے

کاموں میں رکاوٹیں پیدا کرنی شروع کردیتے - مگر ان کے افتاد مزاج کا عمیق مطالعہ مجھے اس امر کے اعلان پر مائل بلکہ مجبور کرتا ہے کہ تملق اور چاپلوسی جس کا ان کے سیاسی معترضین ان پر الزام رکھتے ہیں، ان کی فطرت سے کوسوں دور تھی - یہی نہیں بلکہ تھوڑی سی زمانہ سازی بھی جسکی جھلک ان کی پالیسی میں نظر آتی ہے، ان کی آزاد طبیعت کو بہت ناگوار تھی - ۱۹۰۷ء میں جبکہ مسلم لیگ کے قیام کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے اور مسلمانوں میں سیاسیات کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا، جس کا میں ابھی ذکر کروں گا، کالج کے طلبار نے اسٹرائک کردی اور اسکی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں کے انگریز پرنسپل اور پروفیسروں نے ان کے خلاف پولیس کو مدد دی جو خواہ مخواہ لڑکوں سے جھگڑ بیٹھی تھی۔

اسی زمانہ میں سید احمد خاں کی برسی کی تاریخ آگئی جو ہر سال منائی جاتی تھی اس موقع کے لیے میں نے ایک نظم لکھی جس میں بانی کالج سے خطاب تھا - اور اس میں لڑکوں کے اس کھلے ہوئے جذبۂ خودداری اور غیروں کے حقارت آمیز زیادتیوں کے مقابلہ میں ہر قسم کی قربانیوں پر آمادگی کا تذکرہ کرنے کے بعد میں نے یہ شعر کہا تھا - ؎

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اسکی انتہا ہم ہیں تو اسکی ابتدا تم ہو

سب سے بڑا باغی

اس امر کی شہادت کے لیے کہ صرف میں ہی تنہا سید احمد خاں کی فطرت اور ان کی پالیسی کو اس طور پر سمجھنے والا نہیں ہوں حسب ذیل گفتگو کافی ہوگی -

ایک دفعہ میرے بھائی سے جو اُس زمانے میں سرکاری ملازم تھے ایک انگریز نے پوچھا کہ تمہاری رائے میں آجکل ہندوستان کا سب سے بڑا باغی کون ہے اور اُن کی جواب کی تصحیح کرتے ہوئے اس تجربہ کار افسر نے کہا کہ وہ باغی، وفاداروں کا وفادار سید احمد خاں ہے جب میرے بھائی نے اس تعجب خیز فیصلہ کی مخالفت کی تو اس نے کہا " کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپکے مسلمان نوجوان جو علی گڈھ کالج میں ویسی ہی تعلیم پا رہے ہیں جیسی ہمارے نوجوان ہیرو اور ونچسٹر میں اور جو ویسی ہی زندگی بھی بسر کرتے ہیں اور جو اُن کو انہیں کے کھیلوں میں شکست دینے کا مادہ رکھتے ہیں اس بات پر قانع ہونگے کہ انگریزوں کو جب وہ بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہو کر آئیں اپنے سارے اختیارات دیدیں اور خود منہ دیکھتے رہیں ، نہیں مسٹر شوکت علی، انگریزوں کی مدت حکومت پوری ہو چکی اور اس اعتبار سے وہی وفا شعار سید احمد خاں آج حکومت کے سب سے بڑے باغی ہیں"

ہم میں سے اکثر لوگوں کی طرح اس انگریز افسر نے بھی غیر ملکی حکومت کے زیر اثر مدارس میں حصول تعلیم کے آن اثرات کو محسوس نہیں کیا - جو نوجوانان ہند کے دماغ کو مفلوج کر دیتے ہیں اور صرف انہیں بے چینیوں اور ناراضیوں کو پیش نظر رکھتا تھا - جو اس کا لازمی نتیجہ ہیں - مگر حضرات میں کس منہ سے یہ دعوے کروں کہ علی گڈھ کا یہ بڑا باغی اپنی باغیانہ کوششوں میں کامیاب ہو گیا جبکہ علی گڈھ میں ایک

ایسی مسلم یونیورسٹی جو گورنمنٹ کی سند ، اعانت ، اور نگرانی - امراء کی عطا کردہ سرمایہ کی فراوانی اور اساتذہ وطلبہ کی کثرت کے اعتبار سے تو کامیاب ہے لیکن مقاصد عالیہ سے محروم اور قومی توقعات کے جذبات سے

بلکہ مغربی - اور جس کے دوش بدوش ایک دوسری یونیورسٹی بھی ہے
جو بجز مقاصد عظیمہ اور مطامح عالیہ کے ہر اعتبار سے مفلس و نادار ہے
اور جس میں تین سال قبل میرا قدیم کالج تبدیل ہوتا معلوم ہوتا تھا -
لیکن میرا یقین واثق ہے کہ گو سید احمد خاں کی نظر میں ہندوستان کا
ایسا کوئی قریبی مستقبل نہ رہا ہو - جس میں ان کے مدرسہ کے طلبہ بجز سرکار
کی وفادار رعایا کے اور کچھ ہو سکیں ان کا مطمح نظر ہمیشہ کالج سے ایسے
نوجوان پیدا کرنا تھا جو راسخ الاعتقاد مسلمان اور محب وطن ہندوستانی ہوں -

علیگڈھ اور مسلم لیگ

کلکتہ، بمبئی، مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہونیکے تقریبًا تیس ۳۰ برس
بعد جبکہ ایک نئی نسل پیدا ہو گئی تب کانگریس کی زندگی کا آغاز ہوا - یہ کوئی معمولی
کام نہ تھا کہ واقعہ ۱۸۵۷ء کو گزرے ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئے تھے
کہ ٹھیک اسی حصۂ ملک میں جہاں اس آگ کے شعلے سب سے زیادہ بھڑک چکے
تھے سید احمد خاں مسلمانوں کے لیے ایک انیگلو اورینٹل کالج کے قیام میں کامیاب
ہوئے - کالج کے قیام کے تقریبًا تیس ہی سال کے بعد گویا کسی قانون فطرت
کے ماتحت مسلمانوں کی بھی ایک سیاسی انجمن قائم ہوئی - مسلمانوں نے چونکہ
ابتک سرکاری یونیورسٹیوں سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا - اس لیے اس سیاسی
بیداری میں بھی ان کا کوئی حصہ نہ تھا جو ایک طرح سے اس تعلیم ہی کا نتیجہ تھی اور
یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ سنہ ۱۹۰۶ء کے آخر میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے
کے قیام کے ذمہ دار سید احمد خاں کے کالج ہی کے سپوت تھے -
اب مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا - چند ماہ قبل
مسلمانوں کا ایک وفد لارڈ منٹو والسرائے ہند کے پاس اس غرض سے شملہ

جا چکا تھا کہ مجوزہ مارلے منٹو اسکیم کے متعلق اپنے مطالبات پیش کرے اگر
زمانہ جنگ کے برطانوی اخبار نویسوں کے فیشن کی تقلید کیجائے جو ہر بات کے
متعلق بعد میں یہ کہا کرتے تھے کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں،
تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب اس کے اظہار میں کوئی قباحت نہیں کہ یہ وفد
حسب الحکم' شملہ گیا تھا۔ ظاہر تھا کہ گورنمنٹ اس وقت تعلیم یافتہ ہندوستانیوں
کے مطالبات رد نہیں کر سکتی تھی لہٰذا اس کا ارادہ تھا کہ حسب عادت ایک
لقمہ دیکر کچھ دن کے لیے انکی وہاں دوزی کر دے۔ اس وقت تک مسلمانوں
کی مثال اس آئرش قیدی کی سی تھی جس نے جج کے اس سوال پر کہ اس کا
کوئی وکیل بھی ہے جو اسکی طرف سے پیروی کرے صاف صاف کہدیا کہ "نہیں"
میں نے وکیل تو نہیں کیا مگر جوری میں جو مسلمانوں کے دوست تھے انھوں نے
آہستہ سے اُن کے کان میں کہدیا کہ مجرم کو اور لوگوں کی طرح باقاعدہ مشیر قانونی
کی ضرورت ہے۔ خیر الہام یا القار جہاں سے بھی ہوا ہو لیکن اس میں شک
نہیں کہ اس مرتبہ مسلمانوں کا دعویٰ حق طلبی خوب زور سے پیش ہوا۔ مشترکہ
حلقہ جات انتخاب میں بلاشبہ مسلمانوں کو کافی حق نمایندگی حاصل نہ ہوسکا۔
اور اُن حضرات کو جنہوں نے جداگانہ حلقہ انتخاب کے قیام پر جیسے مسلمان
خواہشمند تھے افسوس اور ناراضی کا اظہار کیا یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے
تھا کہ حق انتخاب جداگانہ مسلمانوں اور اُن کے کثیر التعداد ہندو بھائیوں
میں جدائی کا سبب نہیں بلکہ نتیجہ تھا۔

[illegible]

جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اور ہندو مسلم اتحاد

لیکن اسوقت مسلمانوں کے سرکاری معاونوں کو یہ کیا معلوم تھا کہ اگرچہ
بظاہر یہ اُلٹی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر بھی جداگانہ انتخابی حلقے ہندو مسلم

اتحاد کو اور قریب کر رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانیوں کو حقیقی حق رائے دہی (خواہ وہ کتنا ہی محدود) ہوا مل رہا تھا۔ اور اگر ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ایسے ہی منقسم رہتے جیسے کہ ابتدائے حکومت برطانیہ سے تھے تو مشترکہ حلقے ایک نیا میدان جنگ بن جاتے اور اسطرح ان دونوں قوموں کے اختلافات اور بڑھ جاتے۔ ہر ایک امیدوار انتخاب اپنی قوم سے ووٹوں کے لیے درخواست کرتا اور اپنا حق مقابل قوم کے خلاف اپنے بغض کی شدت دکھا کر کرتا اور اس کے لیے وہ قومی مفاد کی پاسداری یا اسیطرح کے اور بہت سے حیلے تراشتا۔

خود یہی حالت کیا تھوڑی بری تھی مگر ایسے انتخاب کے نتائج اور بھی خراب ہوتے جسمیں دونوں قوموں کا برابر کا مقابلہ نہ تھا اس لیے کہ جو قوم اپنا نمائندہ بھیجنے سے قاصر رہتی اس کے دل میں کامیاب شخص اور اسکی قوم کی طرف سے کینہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا۔ اس حالت میں کہ دونوں قومیں اسطرح برسرپیکار تھیں کسی سیاسی اصول کا انتخاب کے زمانہ میں پیش نظر رہنا بالکل محال تھا۔ لہذا جداگانہ حلقوں کے قیام نے اس باہمی جھگڑے کو فرو کرنے میں بہت مدد دی اگرچہ میں اس امر سے بے خبر نہیں ہوں کہ جداگانہ حلقے ہونیکی حالت میں بھی چونکہ دونوں قوموں کا نفاق بدستور رہنے کی حالت میں بھی انہیں لوگوں کے منتخب ہونیکا زیادہ امکان ہے۔ جو حریف قوم کے مقابلے میں بہت زیادہ کینہ وری کا ثبوت دیں۔

ہندوستان بطور مذاہب وادیان کے سنگم کے

مسلمانوں کی من حیث القوم نمایندگی کے متعلق سارے مباحث میں میں نے جی کھول کر حصہ لیا۔ لیکن جوں ہی کہ مسلمانوں کا حق تسلیم کر لیا گیا اور اس کا عملی صورت ۱۹۱۰ء کے انتخاب سے مل گیا میں نے ارادہ کر لیا کہ دار الحکومت ہند سے

ایک ہفتہ وار اخبار نکالوں اور مقصد یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے میں مدد مل سکے ۔ مجھے بہت فکر اس بات کی تھی کہ مسلمان اس کو سمجھ لیں کہ فوری ضروریات کے پورا کرنے میں آپس کی کشمکش ناگزیر ہے لیکن ہندوستان کے مستقبل کو نگاہوں کے سامنے رکھنا ہی نہایت اہم ہے جس کے لیے قومی وملکی مفاد کی خاطر سارے جھگڑوں کو پس پشت ڈالکر ہم سب کو ملجانا پڑے گا۔

مجھے ایک زمانہ سے یقین تھا کہ ایسے ملک میں جہاں کروڑوں آدمیوں کی آبادی ہو اور ان میں سے ہر ایک مذہب کا ازحد شیدا ہے مگر مذہب قومیت اور تمدن کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے الگ اور دوسرا تیسرے سے جدا ہمارے لیے قدرت نے ایک اہم مسئلہ اور زبردست سوال کے حل کرنیکا بہت اچھا موقعہ بہم پہنچا دیا ہے یعنی مسئلہ اتفاق مذاہب ۱۹۰۴ء میں جبکہ مجھے آکسفورڈ سے ہندوستان واپس آئے ہوئے صرف دو ہی سال ہوے تھے میں نے احمدآباد میں تجویزہ مسلم یونیورسٹی " کے متعلق ایک اڈریس دیتے وقت اس خیال کا دبی زبان سے اظہار بھی کردیا تھا۔ " اگر بجائے اس گمراہ کن اتحاد خیالات " کے کوئی دوسری قوت ہندوستان جیسے وسیع ملک کو متحد کرنیوالی پیدا نہ ہوئی تو یہ جغرافی اصطلاح یا تو اسم بامسمی ہی ہوکر رہیگی یا پھر جیسا کہ میرا خیال ہے مذاہب وادیان کا ایک سنگم بن جائے گا " ہندوستان میں مختلف قومیں اپنی اپنی جگہ پرجو قوتیں رکھتی تھیں اس کا مجھے اندازہ تھا ، تاہم میرے ایمان میری امید ، اور میرے حب آزادی نے متحدہ ہندوستان کی مخفی اجتماعی قوت کو اسوقت بھی مجھ پر ظاہر کردیا تھا ۔ نفاق وشقاق اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بجز ایک سنگم بنا لینے کے اتفاق و اتحاد کی کوئی اور صورت ممکن ہی نہ تھی تاہم میں نے اپنے خطبہ مذکورہ میں ظاہر کردیا تھا کہ اختلاف

کی بنیاد نسل یا وطن پر نہیں بلکہ مذہب پر تھی۔ بیس برس سے بھی زیادہ میں ایک ایسی متحدہ جماعت کا خواب دیکھتا چلا آرہا ہوں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ سے زیادہ باعظمت زیادہ شریفانہ اور اس سے کہیں زیادہ روحانی ہو اور آج بھی جبکہ بہت سے سیاسی پیشین گو ان ایام بد کے دوبارہ پلٹنے کی خبر سنا رہے ہیں جبکہ ہندو مسلمان آپس میں لڑا جھگڑا کرتے تھے میں ہنوز اپنے پرانے خواب یعنی "اتحاد مذاہب ہند" کو دیکھ رہا ہوں یہ اسی خواب کو حقیقت سے بدلنے کی کوشش تھی کہ میں نے اپنا ہفتہ وار اخبار کامریڈ جاری کیا۔ وہ کامریڈ جو رفیق سب کا تھا اور جنبہ دار کسی کا بھی نہیں

حضرات اگر بالکل ہی بے محل نہ خیال نہ کیا جائے تو میں کامریڈ کے پہلے پرچہ کے پہلے مضمون سے کچھ جملے یہاں نقل کردوں

اس وقت سیاسیات ہند کا مطلع باہمی اختلافات سے جیسا کچھ تیرہ و تار ہو رہا تھا اس کے لحاظ سے میری یہ ہمت تو قدرتاً نہ ہوسکی کہ میدان صحافت میں قدم رکھتے ہی میں اپنا یہ خواب عملی کاروبار میں مشغول رہنے والی زودرشک اور شبہ کرنے والی دنیا کو سنانے لگوں، تاہم جو لوگ "خواب" کے قائل ہیں ان کے سامنے ہمیشہ یہ خواب موجود رہا۔ میں نے یکم جنوری سنہ ۱۹۱۱ء کو لکھا تھا۔

ہم اس کو باور نہیں کرسکتے کہ ہندوستان متحد ہے۔ اگر ہندوستان متحد ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ اس سال کے صدر کانگریس کو اپنے دور دراز وطن سے ہندوستان آنے کی تکلیف دی جاتی؟ محض دعوت کا تخیل بھوک کی تکلیف کو دفع نہیں کرسکتا۔ اس سے بھی کم قائل ہم اس تقدس ریائی کے ہیں جس کے نزدیک کسی فرقہ کی کامل اجارہ داری کمال حب وطن کی مرادف ہے وہ ان غریب چڑیوں کی طرح جن کو خوشہ انگور کی تصویر نے دھوکا دیا اور آنکھیں دیکھتے دیکھتے

سیر ہو گئیں لیکن بھوک کی بےچینی بدستور باقی رہی"، ہم میں سے بھی وہ لوگ جو کھرے سونے اور مصنوعی سکون کی چمک دمک میں فرق نہیں کر سکتے ہیں انکے کان ایک دن ضرور یہ صدائیں سنتے سنتے تھک جائیں گے لیکن انکے دل بدستور بےچین رہینگے لیکن ہم جس شخص سے محبت بھی سب سے زیادہ رکھتے ہیں اور خوف بھی سب سے زیادہ کرتے ہیں وہ منصوبہ باز مصلح قوم ہوتا ہے۔ گیٹے نے بائرن کے نسبت لکھا ہے کہ وہ شاعر تو بہت بڑا ہے لیکن جب غور و فکر سے کام لیتا ہے تو بچہ معلوم ہوتا ہے ہم بھی اس شخص کو جس کا نصب العین بلند اور اسکی بےصبری اس سے بھی زیادہ شدید ہو لیس کچھ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ کتنی ہی کوششیں اس پراگندہ ملک میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لیے کی گئیں جنیں ایسی بھی تھیں جو بالکل نیک نیتی پر مبنی تھیں اور ایسی بھی جنکی بنیاد فساد پر تھی، لیکن سب ناکام ہوئیں یہاں تک کہ ہم کو اسکی بھی ہمت نہیں کہ ایک دوسرے کے غلط کوشش کے مقبرہ پر اپنے جذبات کے ادنی اور بےرنگ پھول بھی نذر کر سکیں۔ ہم ایسی غلطی نہیں کرینگے کہ ٹوٹے ہوئے شیشہ کے ٹکڑے کو گوند سے جوڑنے کی کوشش کے بعد اپنی ناکامی پر نوحہ خواں ہوں یا اس ٹکڑے کو سرکش و متمرد بتائیں۔ اور دوسرے الفاظ میں ہماری کوشش یہی رہے گی کہ حالات حاضرہ کا مقابلہ ہمت کے ساتھ کرتے رہیں اور واقعات سے چشم پوشی نہ کریں خواہ وہ ہمارے لیے کتنے ہی شاق و ناخوشگوار ہوں، یہ تدبیر کی خامی ہے کہ تکلیف دہ واقعات سے آنکھ بند کر لیجائے اور حصول اتحاد کا تو پہلا زینہ یہ ہے کہ ہم ان تعصبات کا صاف صاف احساس کر لیں جو دلوں میں جمے چلے آ رہے ہیں جو راہ اتحاد میں حائل ہوتے رہتے ہیں اور جو نفاق و شقاق کے باعث ہوتے رہتے ہیں لیکن جب ہم آج کا انتظام سوچ رہے ہوں تو فکر فردا سے بھی غافل نہ ہونا چاہئے۔

[illegible]

یہ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر مسلمان یا ہندو یہ چاہیں کہ انہیں کوئی کامیابی آپس کے اختلافات کے باوجود یا بغیر باہمی اتحاد عمل کے ممکن ہے تو وہ نہ صرف ناکام ہوں گے بلکہ وہ ناکامی بڑی ہی شرمناک ہوگی لیکن اس راہ میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہے۔ قدیم یا جدید کسی تاریخ میں موجودہ ہندوستان کے حالات مخصوص کی کوئی مثال نہیں ملتی تاریخ کبھی اپنا اعادہ نہیں کرتی۔ پھر بھی تاریخ انسانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور ہمارے لیے بھی بہت سے سبق اس میں موجود ہیں۔ ہندوستان کے مسائل تقریباً بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں لیکن جب یورپ کے مدبرین وخلائق دوست تک باوجود اپنے یہاں کی روزانہ معرکہ آرائیوں کے اور قومی رقابتوں کے انسداد جنگ سے مایوس نہیں ہوتے ہیں بلکہ جنگ کی دیوی کے تخت پر صلح کا جھنڈا نصب کرنے کے خیال میں ہیں، تو کیا ہم ہندوستانی قوم سے مایوس ہو جائیں۔ ممکن ہے ہم اپنے میں وہ ولولہ حب وطن و جوش قومیت نہ پیدا کر سکیں جو بہ کرور متحد القوم جاپانیوں نے پیدا کر لیا ہے، لیکن کنیڈا کی طرح یگانگت بالکل عملاً قابل حصول ہے ممکن ہے کہ ازدواج محبت ہو جس کی بنیاد شعر و فسانہ پر ہوتی ہے لیکن مناکحت رسمی جو یہ پابندی آئین شرفا طے پا جائے۔ اور اس کا نباہ ہوتا رہے، تو وہ بھی کوئی کم درجہ کی چیز نہیں۔ اچھا، اب ہم نثر میں صاف صاف کہنا چاہتے ہیں اور امید ہے کہ شعریت کی دیوی اس مفروضہ مناکحت کے خلاف حکم صادر نہ کرے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بھی آسان کام نہیں ہے لیکن یہ ایسا کام ضرور ہے کہ مادر ہند کے فرزندان و دختران سب اس کے لیے قربانی و خدمت پر آمادہ ہو جائیں۔

اے اتفاق، تو ضرور آئیگا، آدمیوں کو باہم ملا دیگا اور قوموں کو متحد کر دیگا لیکن آج ہمارے سامنے نہیں جو تیرے انتظار کے تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ تو آئیگا ضرور

لیکن کب؟ ایک عرصہ کی مصیبتوں، تکلیف و انتظار، صبر آزما التجاؤں
اور ہمت شکن انکاروں کے بعد۔"

دوستو! تین سال ہوئے کہ ہمکو اس اتحاد کی جس کا میں خواب دیکھ رہا تھا۔
جھلک سے زیادہ دیکھنا نصیب ہو گیا تھا۔ اور اگر آج ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے
جیسا کہ کرنا بھی چاہیے کہ اس خواب کی تعبیر ہمارے حسب منشا نہیں ہوئی تو لازم
ہے کہ ایک بار پھر ہم تمام حالات کی اچھی طرح تحقیق و تفتیش کریں ناخوشگوار ۔ ودشوار
واقعات کا سچائی اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کریں۔ چنانچہ یہی میں کرنا چاہتا ہوں
لیکن اس غرض سے کہ سلسلۂ بیان ٹوٹ نہ جائے میں پھر ان حالات پر عود
کرتا ہوں جو میرے آغاز صحافت کے وقت موجود تھے۔

مسلمان اور حالات ممالک خارجہ

جیسا کہ میں نے پہلے ہی سے خیال کیا تھا، علیحدہ علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب
سے ہندو مسلمان دونوں منتخب ہوئے۔ جو متعدد مجالس واضع قانون
مشترکہ کی حمایت میں مل جلکر کام کرنے کے مخالف نہ تھے تاہم ملک سے باہمی
فرقہ بندیاں قطعی طور پر نہ گئیں مگر اس عرصہ میں ممالک اسلامی پر مغربی اقوام کی
دستبرد نے صورت حالات میں ایک خلاف توقع تبدیلی پیدا کی اور اس کا اثر
ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات پر بہت گہرا پڑا اگرچہ آج ہی ایسے غیر مسلم
قوم دوستوں کی کمی نہیں جو ہندوستان سے باہر اسلامی معاملات کے متعلق
مسلمانان ہند کے جذبات کو حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں حالانکہ اگر وہ ذرہ
بھر بھی غور کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہیں جذبات نے جن کی طرف
میں نے اشارہ کیا ہے اگرچہ مسلمانان ہند کی توجہ کو کسی حد تک اندرونی معاملات
سے ہٹا کر اپنی طرف منعطف کر لیا تاہم ایک بڑا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کی

آنکھوں پر سے اس قدیمی اعتماد اور بھروسے کے پردے اٹھا دیئے جو وہ اپنی غیر ملکی حکومت سے رکھتے تھے اور اس اعتبار سے وہ ہندو مسلم اتحاد پیدا کرنے میں زیادہ حصہ نہ لیتے تھے

سنہ ۱۹۱۱ کا سیاسی مطلع

میرا منشا یہ تھا کہ کامریڈ ایک ایسا اخبار ہو جو ان جذبات کی ترجمانی کرے جو ہندوستان کے مختلف فرقوں کی باہمی تنظیم کی ضرورت کے متعلق میرے دل میں موجود تھے میں چاہتا تھا کہ اس اخبار کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حب وطن سے کما حقہٗ حصہ لینے کے لیے تیار کروں۔ اور اس سے ان کی غیر وطنی ہمدردیوں میں جو آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ روح اسلام کا ایک جز ہے ایک ذرہ بھی کمی نہ آئے۔ جب مجھے پہلے پہل میدان صحافت میں قدم رکھنے کا خیال پیدا ہوا تو مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میری توجہ کا معمولی سے زیادہ حصہ خود اپنے ملک سے باہر اسلامی سیاسیات میں بٹ جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ مصر کے حالات کچھ زیادہ طمانیت بخش نظر نہ آتے تھے اور نہ ترکی و ایران کے جدید نظام دستوری نے ابتدائی اظہار خیر مقدم کے بعد انگلستان کی جانب سے (دول یورپ میں اپنی ایک حکومت سے ہمارا ہمیشہ سابقہ رہا ہے) پوری ہمدردی حاصل کی جو ہماری نظر میں ان شجاعانہ اور ہمت طلب کارناموں کے صلہ میں ان کا حق تھا کیونکہ اس کے بعد ہماری سیاسی مطلع پر اگر دوسری سلطنت تھی تو وہ روس ہی تھی فرانس کی شکست کے بعد اب سے ایک صدی قبل سے وہ براعظم یورپ میں سب سے زیادہ قابل توجہ طاقت رہی ہے لیکن براعظم ایشیا میں عظیم تر حکومت بننے کی کوشش میں اس نے اپنی حالت خراب کر دی ہندوستان کے مالکان قسمت کی طرف سے ہر شخص کو یہ سبق پڑھایا جاتا تھا کہ روس

کو نوع انسان کا دشمن سمجھیں۔ اور یقین کریں کہ مقابلہ کر کے اسکو شکست دینا
انگلستان کا مقدس فرض ہے۔ لیکن جاپان کی تیز رفتار ترقی اور مشرق
اقصیٰ میں جنگ روس میں اسکی عدیم المثال کامیابی نے اگر ایک طرف دوسری مشرقی
اقوام کو سر اٹھانے اور امید باندھنے کی ہمت دلائی تو دوسری جانب اس
نے روس کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ وہ انگلستان کے جانی دشمن سے
اس کا دوست بلکہ حقیقی معنوں میں اتحادی بن گیا اگر اسکا فاتح دشمن جو
(جاپان) اس قوم کا سرکاری اور باضابطہ اتحادی ہمیشہ سے ابتک رہا ہے
اس واقعہ کا اثر فوراً مشرقی سیاسیات پر پڑا اور یہ نہ صرف ایران پر جہاں روس
کھلم کھلا ایک زبردست مطلق العنان حکمراں عارضی طور پر بنگیا اور جہاں
وہ چند ہی روز کے بعد بیابانِ جنگ کا مینہ برسا دینے والا تھا بلکہ ٹرکی
میں بھی جہاں سلاف اور ٹیوٹن دونوں قوموں کی باہمی رقابتیں مزید سرگرمی
کے ساتھ ائتلاف و اتحاد کے درمیان جنگ کی صورت میں نمودار ہوئیں
اب ایک بار پھر مشرق قریب سیاسیات یورپ کا طوفان گاہ بنا۔
یہ تمام واقعات ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرنیکے لیے کافی تھے جو برسوں
سے انگلستان کو ممالک اسلامی کا دوست اور روس کو دشمن سمجھتے چلے آئے تھے
لیکن ہندو مسلمانوں کے سیاسی اختلافات ان کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لیے
کچھ کم نہ تھے۔ وہ جذبات جو بدقسمتی سے ان جماعتی اختلافات کیوجہ سے باہم
پیدا ہو گئے تھے ایک شدید بین الاقوامی جنگ کی صورت اختیار کرنے لگے اور
ایران و ٹرکی نسبتاً بعید نظر آنے لگے۔
لیکن حالات ٹھیک اسطرح جیسے میں نے امید باندھی تھی وقوع پذیر نہیں
ہوئے سنہ ۱۹۱۱ء ممالک اسلامی کے حق میں ایک نامبارک سال تھا۔ ٹرکی، ایران

نہیں ہوئے ہیں ۱۹۱۱ء ممالک اسلامی کے حق میں ایک نامبارک سال تھا ۔ ٹرکی ۔ ایران اور مراکش کی جدید حکومتوں کو سفر اصلاح و ترقی میں باد مخالف کا سامنا کرنا پڑا جس نے چند ہی روز میں باقاعدہ طوفانوں کی صورت اختیار کر لی

دہلی دربار کا اعلان

ہندوستان میں بھی یہ سن مسلمانوں کے حق میں اندازہ سے بڑھکر نامبارک ثابت ہوا ختم سال کے قریب بادشاہ صاحب معظم دہلی میں بظاہر اس غرض سے تشریف لائے کہ ایک شاہی دربار میں بنفس نفیس اپنی تاجپوشی کا اعلان کریں اور اسی موقع پر آپ نے ہندوستان کے لیے ایک بدشگون اعلان فرمایا۔ یہ تسلیم تھا کہ

"حکومت برطانیہ کی روایات اور سرکاری عادات کے خلاف ایک بالکل نئی رسم تھی"

لیکن اس خلاف دستور کارروائی اور اس راز سربستہ کو جو صرف ہندوستان ہی بلکہ صوبہ دار حکومتی سے بھی مخفی رکھا گیا اس بنا پر حق بجانب ثابت کیا گیا کہ وہ شاہی اعلان" ان فیصلوں میں سے جو انگریزی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہونے سے لیکر آج تک عمل میں آئے ایک نہایت زبردست فیصلہ تھا" نیز اس بنا پر کہ جو کارروائیاں اس شورش کی روک تھام کے لیے اختیار کی جا رہی تھیں، جو تلخ امور ناگوار ہوتے" کے ساتھ عام و بے قابو بھی ہوتی جا رہی تھیں، ان بحث و مباحثہ بجائے خود ایک غیر متناہی شورش پیدا کر دیتا۔

ہم سب کو معلوم ہے اس اعلان میں لارڈ کرزن کی کینہ پرورانہ تقسیم بنگال کو منسوخ کر کے مشرقی و مغربی بنگال کو پھر ملا دیا گیا۔ اور بہار اڑیسہ کا ایک نیا صوبہ قائم کیا گیا۔

بالواسطہ بنگال کو یہ سزا ملی کہ پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا۔ جیسا میں نے
اسوقت کامریڈ میں لکھا تھا "میں دونوں اسکیموں کے موافق تھا بشرطیکہ
دونوں میں سے ہر ایک کو بجائے خود دوسرے سے الگ کر کے لیا جائے"
اور "اعلان کے لیے گورنمنٹ ہند کی طرف سے جو وقت، مقام، اور
طریقہ کار اختیار کیا گیا اسکا کوئی لحاظ نہ ہو۔ تقسیم جو اسوقت عمل میں آئی ۱۹۰۵ء
میں آنی چاہیے تھی اور پایۂ تخت کی تبدیلی کی ضرورت ۱۸۵۸ء میں تھی لارڈ
کرزن اور لارڈ لٹن سے یہ گناہ عجلت میں سرزد ہوا تھا۔ اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ اسکی توبہ لارڈ کرزن اور لارڈ کرلو اپنی فرصت میں کر رہے ہیں۔ لیکن
شہنشاہ معظم کے اس اعلان سے صاف ظاہر تھا اور حکومت ہند اور سکرٹری
آف اسٹیٹ کی مراسلات سے بھی یہ معلوم ہو رہا تھا کہ "اس تمام اسکیم کا جزو
اعظم" یہ تجویز تھی کہ دہلی ہندوستان کا آیندہ پایۂ تخت قرار پائے نیز
یہ کہ تقسیم بنگالہ میں جو ترمیم کی گئی وہ اس انتقال صدر حکومت کا گویا محض ضمیمہ ہی
تھی اور اہل بنگال سے یہ توقع رکھی گئی تھی کہ "اس تبدیلی" پر محض اسواسطے
رضامند ہو جائینگے کہ اسکیم کے دوسرے اجزاء محض انکی دلدہی کے
لیے رکھے گئے اور یہ دلدہی کیا تھی؟ یہ کہ دونوں بنگالوں کو متحد کر کے انتقال
پایۂ تخت پر جو اعتراضات ہونے والے تھے انہیں روک دیا جائے۔
سرکار ہند کے مراسلہ میں نہ مشرقی بنگال کی مالی ابتریوں کا کہیں ذکر تھا نہ آسام
کو خواہ مخواہ جزو بنگال بنا دینے کے ناقابل اطمینان نتائج کا اور نہ پھر قسمت
راج شاہی اور ڈھاکہ کے درمیان وسائل آمد و رفت کی دشواریوں کے متعلق؛
حالانکہ ان تمام واقعات کو ایک امر طے شدہ کے غیر مشتہر شدہ بنا سے بھی
بطور اسباب جواز کے پیش کیا جا سکتا تھا۔

اس سے بڑھکر مراسلہ مذکور میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ۱۹۰۵ء کی تقسیم سے دو خاص اغراض جو اسکے بانیوں کے پیش نظر تھے پورے ہو چکے تھے اس اجمال کی تفصیل مراسلہ ہی کے الفاظ میں یہ ہے "اس نے ایک طرف حکومت بنگال کے سر سے بار ہلکا کر دیا اور دوسری جانب مشرقی بنگال کی مسلم آبادی کو وہ منافع اور مواقع دیئے جس سے وہ اس سے پیشتر ایک بڑی حد تک محروم تھے"، لیکن بنگال اس امتیاز سے محروم ہو گیا جو اُسے اپنی دارالحکومت کے ساتھ ساتھ تمام ہندوستان کے پایہ تخت کی حیثیت سے حاصل تھا اور ان مواقع سے بھی اسے پاس پڑوس سے سرکار ہند پر نکتہ چینی کرنے اور ہمیشہ اس پر دباؤ ڈالنے کے حاصل تھے اسوقت تک ہم یورپ کی سیاسیات خارجہ میں "اُصول معاوضہ" کے نفرت انگیز مناظر خوب دیکھ چکے تھے جسکی رو سے مراکش فرانس کے اس لیے حوالہ کر دیا گیا تھا کہ مصر میں انگریزوں کو آزادی حاصل رہے اور طرابلس گویا اٹلی کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا اور جرمنی سے بندرگاہ اگادیر پر جہاز بھیجنے پر مشہور معاملت ہو چکی تھی، اس قاتل سفاک اصول کا اب مصالحانہ انداز سے ہندوستان کے اندرونی نظم ونسق میں ہی آغاز ہو چلا — سرکار ہند نے مراسلہ میں تحریر فرمایا کہ "اس تقسیم سے مشرقی بنگال اور آسام کو بے شبہ بہت زیادہ فوائد حاصل تھے اور اس صوبہ کے مسلمان جو آبادی کے غالب حصہ پر مشتمل ہیں، وفادار اور مطمئن ہیں لیکن ان دونوں صوبوں میں بنگالیوں کی ناراضگی جو سب سے زیادہ صاحب اثر و تعداد تمام پیشوں قابض اور پبلک معاملات پر چھائے ہوئے ہیں جیسی زبردست پہلے تھی اب بھی باقی ہے۔

میں نے اس موقع پر تحریر کیا کہ۔

"اس سے آسان کام اور کیا ہو سکتا ہے کہ وفادار و قناعت پسند لوگوں سے دنیوی ساز و سامان کی کچھ اور اشیاء سے سبکدوش غیر مطمئن اور شاید غیر وفادار لوگوں کو بطور انعام اور معاوضے کے دیکر اسے اور بھی گرانبار کر دیا جائے مسلمانوں کے پاس کوئی بنبھر نہیں جسے اگادیر بھیجیں اور سیاسی حکمت عملی کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ بنبھر نہیں تو معاوضہ بھی نہیں

اسکا اثر سیاسیات اسلامی پر

میں نے کامریڈ میں جہاں یہ لکھا تھا کہ "ہمارے خیال میں مسلمانان کو گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو منظور کر لینا چاہیے" تو ساتھ ہی یہ لکھنے پر بھی میں نے اپنے تئیں مجبور پایا کہ وہ اس برتاؤ کے مستحق نہ تھے۔ تقسیم بنگالہ سے قبل اُنہوں نے ہر طرح کے مصائب اٹھائے تھے اور دنیا کے برتاؤ ان کی طرح انھیں نہایت صبر و سکون سے برداشت کی تھیں اُنھوں نے تقسیم بنگالہ کے لیے نہ تو کوئی شور و شغب برپا کیا تھا اور نہ کوئی جد و جہد کی تھی باایں ہمہ تقسیم بنگالہ ان کے حق میں حق بحقدار رسید اور نعمت غیر مترقبہ دونوں ثابت ہوئی تھی۔ ان کی حالت کی ترقی کے ساتھ ان کی امیدیں اور توقعات بھی روبہ ترقی ہو رہی تھیں یہ صحیح ہے کہ ہر نو دولت کی طرح ان سیاسی نو دولتوں نے بھی اپنی امیدوں کا پیمانہ بہت بلند کر لیا اور بعض اوقات مور کی طرح چم خم دکھانے لگے لیکن بھنگ کا نشہ کتنی دیر تک رہ سکتا ہے چند ہی روز میں ردعمل شروع ہوا اور اس قیامت کے ساتھ کہ انھیں ہلا دیا۔ یہ آزاد شدہ غلام پھر دوبارہ قید غلامی میں آ گئے اور آہ لذت انتقام سے کون دست بردار ہو سکتا ہے۔ ان کے آقایان قدیم بالکل قابل معافی ہوتے اگر دوبارہ اپنے ان غلاموں کو قابو میں پا کر مشق تازیانہ ذرا اور زور کے ساتھ کرتے مشرقی بنگال کے مسلمانوں سے انکے حاکموں کی طرف سے جنگ میں خود انکے ہمسایوں کے خلاف کام لیا گیا تھا اور اب جب کہ ان حکمرانوں کے لیے جنگ کا جاری رکھنا آسان نہ تھا تو اُنھوں نے اپنی صلح تو آسانی اور جلدی سے کر لی اور مسلمانوں کو ان لوگوں کے رحم پر چھوڑ دیا جن کے خلاف اُن کو جنگ کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ تاریخ میں بے وفائی و غداری کی اس سے ذلیل تر مثال کا ملنا دشوار ہے جس میں وفاداری کا بدلہ اپنے حاصل کردہ حقوق سے محرومی سے ملا ہو اور "قناعت پسندی" کی سزا ایک

بدترین جرم سمجھ کر دی گئی ہو میرے خیال میں اس واقعہ کا ذکر کر دینا شاید مناسب نہ ہوگا
اعلان دربار کے بعد ہی جب میں سر چارلس بیلی سے جو اس صوبے کے حکمران تھے جکی
حکومت اب گھوڑے پر ڈال دی گئی تھی ملاقات کو گیا تو وہاں لارڈ سنہا اور سر نیوڈمتر
بھی ملے جنھوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس اعلان کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔ میں نے
ان سے کہا کہ بنگال کے ہندوؤں کے لیے تو یہ اعلان داد ستد کی ایک باہمی معاملت
تھی اور "یہ بچے وفادار" بہاریوں کے لیے صرف "ستد" اور مشرقی بنگال کے مسلمانوں
کے لیے یہ محض داد سے زیادہ نہیں۔ اور اپنی وفاداری و قناعت پسندی کا بدلا انھیں
یہ ملا کہ ذلت و خواری کا بڑا طوق اُن کے نصیب میں آیا۔" اس کے بعد میں دل ہی دل
میں یہ دعا کرتا ہوا وہاں سے چلا آیا کہ خدا نکرے کہ وہ اس بوجھ کی تکلیف سے گھبرا اٹھیں
اس سے ذرا قبل خود عین دربار میں مجھے یاد ہے کہ جس وقت میں جلدی جلدی اعلان
پڑھنے میں مصروف تھا میرے پرانے دوست سر چارلس کلیولینڈ، افسر اعلیٰ محکمہ سی
آئی ڈی، نے مجھے مخاطب کیا۔ اتفاق سے اڈیٹروں میں سب سے پہلے مجھے
ہی اس افسر کے ہاتھ سے جو اعلان کی کاپیاں تقسیم کر رہا تھا۔ ایک کاپی ملی تھی۔
سر چارلس نے مجھ سے مذاقاً دریافت کیا کہ اس اعلان میں ہمارے تمھارے لیے بھی کچھ
ہے؟ اس پر میں نے اپنی ناگواری بمشکل ضبط کر کے یہ جواب دیا کہ "میرے لیے تو کچھ نہیں
ہاں آپ کے لیے بہت کچھ کام ہے!" آج کون کہہ سکتا ہے کہ میری یہ پیشین گوئی صحیح ثابت
نہیں ہوئی؟

دوستو، میں نے اس معاملہ میں صرف اس غرض سے اس قدر طوالت کی کہ میرے
خیال میں اعلان دربار مسلمانوں کی سیاسی ترقی کا امتیازی نشان رہا ہے اس سے زیادہ
اور کوئی شے مسلمانوں میں یہ یقین نہیں پیدا کر سکتی تھی کہ ان کا دوسری قوموں کے
مقابل میں غیر ملکی حکومت پر اعتماد کرنا اُن کے لیے ہمیشہ اس قسم کی بدعہدی کے خطرات

لکھا ہے "اب آنکھوں سے یہ سمجھ لیا کہ اس قسم کی امداد پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ امداد اندرون ملک ہو یا بیرون ملک اس کی ضرورت ہو۔ اور اس وجہ سے وہ یہ بھی سوچنے لگے کہ شاید اپنی اغراض کی اس سے بہت کم قربانی کرنے پر وہ دائمی امن بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے ہمسایہ قوموں اور ہموطنوں کی دوستی بھی۔

حکومت خود اختیاری مسلم لیگ کا نصب العین قرار دیگئی

مسلم لیگ جو کبھی بھی ہندوؤں یا کانگریس کے خلاف نہیں رہی ہے تقسیم بنگالہ کے زمانہ ایجیٹیشن میں پیدا ہوئی اور اس نے قدرتاً اپنے نصب العین میں جماعتی مفاد کے تحفظ اور حکومت کی وفاداری پر زور دیا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ہمسایہ اقوام کے ساتھ اتحاد و اتفاق بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ دہلی دربار میں جو اعلانات ہوئے اس کے ایک سال بعد لیگ کی کونسل نے لیگ کے نصب العین میں تبدیلی کی سفارش کی اور اس نئے نصب العین کی رو سے سفارش کی گئی کہ اب اس کا مطمح نظر "ہندوستان میں حالات کے لحاظ سے حکومت خود اختیاری کا حصول" قرار دیا جائے۔ اس تبدیلی پر بحث کرتے ہوئے جسے آخر کار مارچ کے سالانہ اجلاس میں لیگ نے منظور کر لیا، میں نے لکھا تھا کہ مسلمانوں کے لئے ان کا نیا نصب العین "اس مکان کے مانند ہے جو نصف راستہ پر واقع ہوا اور جہاں سے ان کی منزل مقصود اچھی طرح نظر آتی ہو" اور میں سمجھتا ہوں کہ ہماری حالت موجودہ کا صحیح اندازہ کرنے میں مدد دینے کے لیئے ذیل کی عبارت اس تاریخ کے کامریڈ سے نقل کردوں جس پر مجھے امید ہے کہ میرے تمام قوم پرست دوست خواہ مسلمان ہوں یا ہندو غور فرمائیں گے۔ "لیکن حکومت خود اختیاری کے حصول کا انحصار نہ تو حکومت اور ذمہ دار ارباب حکومت کی اصلاح پر ہے اور نہ حاکم و محکوم کے تعلقات پر حکومت خود اختیاری احساس خود شناسی کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور ہندوستان میں اب تک بحیثیت مجموعی یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوا ہے آج

مختلف فرقوں اور طبقوں میں باہم اگر مخالف اغراض و مقاصد کی بنا پر چوکش مکش اور نفسانفسی رہتی ہے، ان میں ایک دفعہ یہ خیال پیدا ہو جانے دیجئے کہ ہندوستان جس طرح "جسم" کے اعتبار سے متحد ہے "روح" کے اعتبار سے بھی متحد ہو سکتا ہے، یہی نہیں بلکہ اس اتحاد کو اس طرح محسوس ہونے دیجئے جس طرح ایک جسم اپنے اعضا کی مختلف شکل و صورت اور اپنی عقل و روح کے مختلف ادراکات و تصورات کے باوجود اپنے آپ کو ایک ہی فرد محسوس کرتا ہے تو پھر روے زمین کے پردے پر کوئی طاقت ایسی نہیں جو اسے حصول حکومت خود اختیاری میں مانع و مزاحم ہو سکے۔ لیکن جس طرح ہم اپنے ابنائے ملک کو سیاسی نصب العین کے انتخاب کے متعلق متنبہ کر چکے ہیں اسی طرح انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ وہ مختلف فرقوں کو ایک قوم میں متحد کرنے میں بندر کی سی نقالی نہ کریں .... ہندوستان میں سیاسی اتحاد ان چھوٹے چھوٹے فرقوں کو بالکل مٹا کر جو اتحاد کی آخری منزل میں متصادم نظر آئیں، قائم نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی قوت کو تسلیم کرنے اور ان کے وجود کو لا بد مان لینے ہی سے ہو سکتا ہے اگر ہندوستان میں کوئی سوسائٹی قائم ہو جس کا کام مختلف فرقوں کو ایک قوم میں متحد کرنا ہو تو اس کا طرز اس سے بہتر نہیں ہو سکتا جو امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ نے تجویز کیا ہے۔ یعنی وحدت کثرت "

مسلمان اور بیرونی معاملات

بیرونی معاملات کے لحاظ سے ۱۹۱۲ء کا آغاز ۱۹۱۱ء سے قطعی مختلف توقعات کے ساتھ ہوا آخیر تک مسلمانان ہند کو یہ امید تھی کہ حالات از خود درست ہو جائیں گے

لیکن ایسا نہ ہوا اور اس سال کا اختتام اس کے آغاز سے کہیں بدتر ہوا۔ ۱۹۱۱ء کے آخر میں مسلمانان ہند اٹلی کی طرابلس میں اس شرمناک غارت گری سے کمال درجہ متاثر ہوئے جس نے یورپ کے بین الاقوامی اخلاق کا بُری طرح پردہ فاش کیا اگر ضرورت تھی کہ اس اخلاق کا اس سے زیادہ پردہ فاش کیا جائے تو وہ ایران میں اُس کے طرزِ عمل اور برطانیہ کی تسلیم یا ایسی پوری ہوگئی۔

ان دونوں واقعات میں یورپی تمدن میں بہیمیت کی نہایت ہی قبیح شان تھی کون ہے جو نخلستان طرابلس کا قتلِ عام بھول جائے اور کون ہے جو اس جگر دوز سانحہ کو فراموش کر دے کہ سال نو کے آغاز پر شہدائے کربلا کا ماتم تو ہو ہی رہا تھا روسیوں نے بہتوں کے ساتھ شمالی ایران کے سب سے بڑے مجتہد ثقۃ الاسلام کو پھانسی پر لٹکا دیا جن کے علم و فضل، تقدس اور مسالمت کی عام طور پر عظمت کی جاتی تھی ان باتوں نے مسلمانوں کے قلوب کو جو دُکھ اور صدمہ پہنچایا، اس میں اگر کچھ ذرا اضافہ ہو سکتا تھا تو وہ اٹلی کے ایروپلین کے ذریعہ سے کعبۃ اللہ شریف پر حملہ کرنے کی دھمکی اور مشہد مقدس پر روسیوں کی گولا باری نے کر دیا۔

مسٹر شسٹر جب ایران سے نکالے جانے کے بعد لندن گئے تو وہاں کی انجمن ایرانی نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی اس موقع پر انہوں نے کہا اور بالکل سچ کہا:—

"خود مجھے جو کچھ پیش آیا اس کا مجھے مطلق غم نہیں لیکن میں منافق ہوں گا۔ اگر مسلمانوں کے غم و غصہ پر ہمدردی کا اظہار نہ کروں جنہوں نے یہ تلخ تجربہ حاصل کیا ہے کہ بین الاقوامی سیاست میں احکام عشرہ کا نفاذ و اطلاق نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو اسے چاہیے کہ پچھلی سال کے واقعات پر نظر ڈالے"۔

ان تلخ تجربوں کے بعد ۱۹۱۲ء میں اُن سے زیادہ تلخ تجربے پیش آنے والے

تھے جو آکر رہے تھے یعنی اسی سال کے موسم خزاں میں جنگ بلقان چھڑ گئی جس کے دوران میں ایک دفعہ تو یہاں تک اندیشہ ہو چلا تھا کہ ترک جو پانچ سو برس تک یورپ میں حکومت کر چکے تھے وہاں سے نکال باہر نہ کر دیئے جاویں۔

مسلمانان ہند کے جذبات پر اثر

انگلستان نے ٹرکی، ایران اور مراکش کے دشمنوں کے ساتھ جو روش اختیار کی تھی اس سے مسلمانان ہند کی ہمدردی انگلستان کے ساتھ سنہ ۱۹۱۱ء ہی سے کم ہونے لگی تھی۔ اور اس کا اثر ان کے اور یہاں کے انگریز حکام پر بہت بڑا پڑا۔ باوجودیکہ ہندوستان کے انگریزی حکام کو انگلستان کی برسر اقتدار ریڈیکل جماعت سے نفرت تھی پھر بھی وہ ہندوستانیوں کی روش پر متحیر تھی کہ وہ اس جرات اور صاف گوئی سے جو محکوم قوم سے ازبس بعید ہے حکومت انگریزی پر برابر نکتہ چینی کر رہے تھے۔

کامریڈ کا مقدمہ جس میں پہلی مرتبہ اہل ہند کو اس قانون مطابع کی طاقت نقصان رسانی کا حال معلوم ہوا جو اب شکر ہے کہ منسوخ ہو گیا ہے آپ میں سے اکثر حضرات کو یاد ہوگا کہ اس رسالے کی ضبطی کے متعلق تھا جو ترکوں کی طرف سے وصول ہوا تھا۔ اس رسالے میں ترکوں نے انگلستان سے صرف یہی درخواست کی تھی کہ وہ بلقانی حلیفوں کے خلاف انہیں محض مسیحی ہمدردی کی بنا پر مدد دیں اور اس ضمن میں انھوں نے مقدونیہ کے مظالم بیان کئے تھے۔ یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ کانپور کی مسجد کے ایک حصے کے انہدام کے بعد کے مہلک طرز عمل نے مسلمانوں کے جذبات کو اور بھی برہم کر دیا انہیں حالات کے باعث میں مسلم لیگ کے اس زمانہ کے سکرٹری کو ساتھ

لیکر انگلستان گیا - تاکہ خود برطانوی حکومت سے استغاثہ کروں اور توجہ دلاؤں
کہ ہندوستان اور نیز ممالک غیر میں اپنی اس پالیسی کو بدلدے جو کسی کے لیے بھی
سود مند نظر نہیں آتی اور جو یقیناً مسلمانوں کو مایوسی کی حد تک پہونچادیگی - اس
میں مجھے کسی قدر کامیابی ہوئی لیکن سال کے اندر ہی ایسے اہم و عظیم واقعات
پیش آئے جنہوں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جنگ کے آغاز سے
قبل مسلمانان ہند کا ایک دوستانہ وفد لارڈ ہارڈنگ کی خدمت میں حاضر ہوا
جو نہایت امید افزا تپاک سے وفد کے ساتھ پیش آئے مگر جنگ عظیم
اور نیز اُن واقعات نے جن کی بنا پر ٹرکی نے انگلستان کے فریق کے خلاف
لڑائی میں شرکت کی، ہمارے سارے توقعات پر پانی پھیر دیا۔

آغاز جنگ اور مسلمانان ہند کے جذبات

جرمنی سے جب لڑائی چھڑی تو میں خیال کرتا ہوں کہ میں نے ۱۲ اگست ۱۹۱۴ء
کے کامریڈ میں ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور ذمہ دار گروہ کے خیالات کی صحیح ترجمانی
کی ہے جس کی خودداری چاپلوسی کا خفیف شائبہ بھی گوارا نہیں کرسکتی، اس تاریخ کے
کامریڈ میں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"اب بھی بعض ایسے سنجیدہ لوگ خود ہندوستانیوں میں موجود
ہیں اور اگرچہ وہ اپنی سرکاری خدمات کی تشہیر نہیں کرتے ہیں،
وہ جو کچھ بھی اثر لوگوں پر رکھتے ہیں - اسے وہ گورنمنٹ کی دشواریوں کے
کم کرنے میں استعمال کرینگے نہ کہ بڑھانے میں - ان کی سب سے قوی
دلیل یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے موجودہ منزل ارتقار میں
اس کا تعلق برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ قائم رہنا لازمی و ضروری
خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ یہ خود غرضی کا خیال پست جذبہ

بجائے خود جی حضوریوں کے زبانی وفاداری سے کہیں زیادہ
حالات مخالف کے مقابلہ میں مضبوط اور بہتر ثابت ہوگا۔

برطانیہ عظمیٰ نے ٹرکی۔ ایران ۔ مراکش کے معاملات میں مسلمانان ہند
کے جذبات کا احترام کیا۔ یا نہیں ۔ وزرائے انگلستان کے وعدے ترکوں
کے ساتھ انکی گذشتہ جنگ کے نازک ترین موقع پر انصاف یا معقولیت پر
مبنی تھی یا نہیں ؟ ۔ بوسنیا اور ہرزیگوینیہ کے علاقہ میں آسٹریا کی اور طرابلس کے
علاقے میں اٹلی کی معاہدہ شکنی پر انگریزوں کا جو طرز عمل رہا ۔ اسے ان کے
اس اعلان سے کچھ بھی مطابقت ہے ۔ جو انھوں نے حال میں عہدناموں کے احترام
کے بارے میں فرمایا ہے ۔ ؟ طرابلس اور بلقان میں شیرخوار بچوں بے ناصر و یار عورتوں
اور صاحب فراش ضعیفوں کو جس طرح ذبح کیا گیا ۔ اس پر انگلستان کے ضمیر
کو کچھ حرکت ہوئی ؟ گوری نوآبادیوں کا برتاؤ اپنی ہی جیسے محکوم کالی رعایا کے ساتھ
نیک رہا کیا ہے یا بد ؟

سرکار انگلستان نے ان غلطیوں کی اصلاح کے لیے ان کرنلوں پر کوئی
دباؤ ڈالا ۔ یا ابتک اپنی ناقابل تحسین بے بسی کا عذر پیش کرتی رہی ہے ؟ ہندوستانیوں
کا جو حقوق و فرائض کے مساوی طور پر لحاظ کئے جانے اور اپنے ملک کی حکومت میں معقول
حصہ دیئے جانے کا مطالبہ چلا آتا ہے اس مطالبہ کو انگریزی دفترشاہی نے ابتک
بہ رضا و رغبت سنا ہے یا بغض و عداوت کے کانوں سے ؟ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ میں
مسلمانوں کو انکی وفاداری کا صلہ ملا ۔ یا ان کے جمود کو ذاتی سمجھ لیا گیا ؟
ان کی عبادتگاہوں اور ان کے مقابر کا احترام ہر جگہ ملحوظ رکھا گیا ۔ یا بعض وقت
انسے رعب حکومت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ۔ ؟ ہم کہتے ہیں کہ ان سب سے
قطع نظر کرکے یا زیادہ صحیح طور پر ان سب سے موازنہ کرکے ہم نے اس خیال کو

سب پر مقدم پایا ہے۔کہ ہمارے لیے ہماری اپنی قومی وجماعتی ارتقار کی موجودہ منزل میں انگلستان کے زیر تربیت رہنما لازمی ہے اور یہ دیکھکر کہ انگلستان نے ہمارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں۔ان سے کہیں بھاری پلّہ اس کے احسانات کا ہی ہم بصداق بنیت اور بطیب خاطر اس کے وفادار ہیں گے۔عام اس سے کہ وہ جرمنی کی بحری قوت کو توڑکر یورپ کا مطلق العنان حکمران ہوجائے یا بحر شمالی میں اس کے عظیم الشان بیڑہ کا آخری جہاز بھی غرق ہوجائے اور اس کا آخری سپاہی بیچ یا لندن میں کام آجائے. . . . .

اگر انگلستان کو ہماری ضرورت نہ بھی ہو ۔ تو بھی ہمیں تو اسکی ضرورت باقی ہے ہم چونکہ سیاسی مکائد کے نہیں بلکہ سیاسی خلوص کے قائل ہیں اس لیے زمانہ امن میں ہم نے انگلستان کے بڑے بڑے حکام سے نبرد آزمائی کی ہے۔ لیکن زمانہ جنگ میں خانگی مناقشات میں ہتھیاروں کی جھنکار اور صدائے مخالفت بند ہوجانی چاہیے اور اگر ہم دوسروں میں اس جنگ کے لیے وہ جوش و سرگرمی پیدا کر سکیں جیسے ہم خود بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں تو بھی ہم گورنمنٹ کو یقین دلائے ہیں کہ جہانتک ہمارا اور ہمارے حلقہ اثر کا تعلق ہے۔وہ مطمئن رہ سکتی ہے۔صوبہ کے سرکاروں اور ان سے بھی بڑی سرکاروں یعنی خداوندان اضلاع تو الگ رہے اگر خانگی شورش کے رفع کرنیکی ضرورت ہوگی۔تو ادنی سے ادنی اور چھوٹے سے چھوٹے پولیس کا پیادہ اپنے اشارہ پر ہمیں حاضر و آمادہ پائے گا۔ہم اس سے بڑھکر کوئی دعوی نہیں کر سکتے۔اور اس سے بڑھکر کوئی دعوی نہیں کرتے اور اس سے گھٹکر کوئی توقع نہیں دلاتے یہی ہمارا مسلک آبتک رہا ہے اب بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

حضرات! ۔مجھکو خوف ہے کہ شاید" کامریڈ" کے ان لمبے لمبے اقتباسات سے

آپ پریشان ہو گئے ہوں گے لیکن اس مقصد کا خیال کرتے ہوئے جو میرے پیشِ نظر ہے امید کہ آپ معاف کریں گے اس طویل بیان سے غرض یہ ہے کہ دنیا دیکھ لے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات اس گورنمنٹ کے متعلق اب سے کچھ پہلے تک کسقدر مختلف تھے اور ہم نے ناالضافی بے اعتنائی اور قساوتِ قلبی کے متواتر طرزِ عمل کو برداشت کرتے ہوئے کیسے صبر و سکون کا کسقدر اظہار کیا۔

ٹرکی اور مسلمانانِ ہند کے جذبات

گورنمنٹ کے ایما پر اور اسی کے ذریعہ میں نے اپنے اور اپنے محترم دوست ڈاکٹر انصاری کی طرف سے طلعت پاشا مرحوم و مغفور کو اس مضمون کا تار دیا تھا کہ لڑائی میں شریک ہونے سے قبل ترکی کو اچھی طرح غور کرلینا چاہیے۔ اور جبکہ ان ناعاقبت اندیشانہ دھمکیوں سے جیسی کہ مثلاً لندن ٹائمس دے رہا تھا ۔ ٹرکی کو لڑائی میں شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا ۔میں نے ٹائمس کے ایک جواب میں "ترکوں کو چارہ کار" کے عنوان سے کامریڈ میں ایک طویل مضمون شائع کیا جو بہت زیادہ مقبول ہوا اور ولایتی اخباروں نے بہت پسند کرکے اس کے حصۂ کثیر کو اپنے صفحات میں نقل بھی کیا اس مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنی غیر ملکی حکومت کو مدد دینے کے لیے کس حد تک مستعد ہیں ۔

میں یہاں صرف وہی حصہ نقل کروں گا جو خاتمہ بحث ہے جس پر میں مفصل دلائل بیان کرنے کے بعد پہنچا تھا ۔اور جسے میں نے مسلمانوں کے سامنے ہدیں غرض پیش کیا تھا کہ وہ اس کو اپنی قومی پالیسی قرار دیں۔میں نے لکھا :۔

ان سب لوگوں نے جو حقیقی وفادار ہیں کام کے ساتھ عمرانی بحث و مباحثہ کے باب کا خاتمہ کردیا اور اب اسے پھر نظر بھر کر بھی نہ دیکھیں گے۔جو کچھ ہماری شکایات

ہوں جو اصلاحات ہم چاہتے ہوں، ہر جز وقت مناسب کے لیے ملتوی رہے
اگر گورنمنٹ بھی ہمیں وہ سب کچھ دے دے۔ جو ہمیں محبوب و مطلوب ہیں مثلاً اگر
ہمیں مسلم یونیورسٹی ہمارے ہی شرائط پر دے دیجائے۔ یا قانون مطابع کی
منسوخی کا اعلان کیا جائے یا حکومت خود اختیاری تک ہمیں دیدی جائے تو ہم گورنمنٹ
سے بہ ادب کہیں گے کہ یہ وقت اس کا نہیں ہے اور ہم بالفعل ان عطیات
کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دینگے مراعات صلح کے زمانہ میں مانگی اور دیجاتی ہیں
ہم روسی پولینڈ کے رعایا نہیں ہم رشوت نہیں چاہتے اس جلسے خاتمہ بحث
نے اخبار مارننگ پوسٹ کے نامہ نگار ساکن کلکتہ کو
بھی مطمئن کردیا

پھر بھی اسی مضمون کی اشاعت کی وجہ سے کامریڈ کی ضمانت ضبط کیگئی اور بالآخر
مجھے وہ پرچہ بند کرنا پڑا۔ انہیں حالات کی بنا پر انگلستان کے ایک موقر ہفتہ وار
رسالہ "دینو اسٹیٹس مین" نے گورنمنٹ ہند پر اپنے ایک مقالہ میں جس کا مضمون
ہندوستان میں وفاداری کی ترغیب" تھا بہت بری طرح اعتراضات کیے
اور جب ٹرکی سے حقیقتاً جنگ چھڑ گئی تو دہلی میں ریوٹر اور اسوشیٹیڈ پریس
کے ایک نمایندے نے میرے خیالات معلوم کرنیکے لیے مجھ سے
گفتگو کی اور اس کے بعد مجھے مطلع کیا کہ وائسرائے نے قبل اشاعت
ان تمام باتوں کو بہ نظر امتحان دیکھا جو مجھ سے دوران گفتگو میں ہوئیں۔ اس
سے پیشتر مضمون میں یہ پیش گوئی کر چکا تھا کہ اگر ترکوں سے جنگ شروع ہو گئی
تو بھی ہندوستانی مسلمان اپنی وفاداری پر قائم رہینگے۔ اور
جبکہ جنگ چھڑ گئی تو میں نے مکرر کہا کہ وفاداری اب بھی قائم رہے۔ میں نے
انکو مشورہ دیا کہ وہ اپنی روح خدا کے تفویض کریں اور ملک میں قیام امن

کے لیے اپنی خدمات گورمنٹ کے سپرد کردیں۔ میں نے اسوقت انھیں
ایسے بچوں سے تشبیہ دی تھی جن کے والدین آپس میں لڑ رہے تھے
میں نے لکھا تھا کہ "چاہے ماں برسرِ حق ہو چاہے باپ ہر حالت میں رنج
و کلفت بچوں کے نصیب ہوگی"

مسلم وفاداری کی حدود

ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمایندے سے گفتگو اور رینیز اپنے اس مضمون
میں جو کامریڈ بند ہونے سے قبل نکل چکا تھا۔ میں نے اس امر کو اچھی طرح واضح
کردیا تھا۔ کہ مسلمانان ہند اُن وعدوں پر جو مذہب اور مقامات مقدسہ
کے متعلق انگریزوں اور ان کے اتحادیوں نے کیے ہیں پوری طرح اعتماد
رکھتے ہیں۔ میں نے صاف طور پر اس امر کی تصریح کردی تھی کہ جزیرۃ العرب
پر حملہ نہ کیا جائے نہ مقامات مقدسہ کی اس حفاظت کو خطرے میں ڈالا جائے
جو کامل آزاد اسلامی طاقت کے ذریعہ سے کیجاتی ہے" اگر یہ بات نہ تھی کہ غیر مسلم
حکومت مسلمانوں سے چاہتی ہے کہ وفاداری حکومت کے مقابلہ میں احکام
مذہب کوئی حقیقت نہیں رکھتے تو امور مندرجہ بالا ہی اقل امور تھے جن کے مسلمان
مستحق تھے۔ گفتگو اس بیان پر ختم ہوئی کہ مسلمانوں سے حضرت مسیح کی تعلیم کے مطابق
عمل کرنیکی توقع کرنی چاہیے یعنی" کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔" لیکن جس ممتاز
نامہ نگار نے مجھ سے یہ ملاقات کی تھی اسی سے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ اخباری
تاروں کے سنسر نے جو یقیناً ایک عیسائی تھے حضرت مسیح کے قول کو باقی تار دیتے
وقت بڑی احتیاط سے خارج کردیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ رس حاکم نے
جو کلیسا کے اقتدار حکومت سے آزاد رہنے کا قائل نہ تھا یہ خوب تاڑ لیا تھا، کہ اگر
مسلمانوں کو یہ یاد دہانی کی گئی کہ قیصر کو "وہ جو چیز قیصر کی ہے"، تو کہیں ایسا نہو

کہ ان کو اس سے ملے ہوئے اس قول کی بھی یاد آجائے کہ "وہ اللہ کو دو چیز اللہ کی گ

احکام اسلام کی اہانت اور اسلامی حقوق سے اعراض

چند ہی روز گذرنے پائے تھے کہ یہ اندیشہ واقعہ بن گیا ہمارے ساتھ جو غداری کی گئی وہ ابھی کل کی بات ہے۔ اس لیے اسکی تاریخ کے بیان مفصل اعادہ کی ضرورت نہیں۔ دوران جنگ میں مسلمانوں سے انکے احکام شرعی کے علی الرغم یہ مطالبہ کیا گیا۔ کہ وہ خلیفہ اور مجاہدین اسلام کے مقابلہ میں گورنمنٹ کی حمایت کریں۔ جزیرۃ العرب جس میں شام۔ فلسطین اور عراق عرب شامل ہیں۔ اور جس کو غیر مسلموں کے اثر و اقتدار سے ہمیشہ آزاد رکھنا مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے اسی جزیرۃ العرب پر انگریزوں اور اتحادیوں کے طرف سے مسلمانوں کے رسول برحق کی مشہور و معروف آخری وصیت کو پس پشت ڈال کر حملہ کرکے قبضہ کر لیا گیا۔ اور اب تک یہ ان کے زیر سیادت ہے۔

مسلمانوں کے مقامات مقدسہ سے مراد صرف چند عمارتیں نہیں ہیں۔ بلکہ مقامات مقدسہ سے وہ تمام علاقے مراد ہیں جن میں تینوں حرم مکہ۔ مدینہ۔ اور بیت المقدس شامل ہیں۔ یہ مقامات مقدسہ خلیفۃ الرسول اور امیر المومنین سے چھین لیے گئے ہیں۔ کہ وہی انکا واحد حقیقی اور جائز محافظ اور خادم ہے لیکن آجتک اسے اسکی اجازت نہیں۔ کہ ان مقامات پر قابض ہو سکے یا انہیں حملوں سے محفوظ رکھ سکے۔ یا کسی طرح ان کی خدمت کر سکے۔

خلیفہ کی سلطنت پارہ پارہ کر دی گئی۔ غیر مسلموں کو اس کی فرمان فرمائی سپرد کر دی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کی دنیاوی طاقت اس حد تک کمزور ہو گئی کہ غیر مسلم قوتوں کے دباؤ کیوجہ سے مسلمانوں کا مذہبی اور روحانی اقتدار بھی معرض خطر میں آگیا۔ ان تمام حالات پر اصرار آخر وقت تک تمام اتحادیوں کی جانب سے

ہوتا رہا اور سب سے زیادہ سرکار برطانیہ کی طرف سے پھر یہ بھی ہم سب کو معلوم ہے
یونان التوائے جنگ کے بعد بھی صلح جنگ کے تمام بین الاقوامی قوانین پس پشت ڈالکر
انگلستان کا ٹھو بنکر انگلستان کی عافیت سوز پالیسی پر عمل درآمد کرتا رہا۔
دوسرے اتحادیوں نے عصمت پاشا کی لوزان میں خواہ کتنی ہی مخالفت کی ہو لیکن غازی
مصطفٰی کمال پاشا کے راستہ میں اس دردناک سرگذشت کے خاتمہ تک
انگلستان ہی سب سے زیادہ روڑے اٹکاتا رہا۔ مسلمان حکومتوں
اور آبادیوں کے ساتھ دوسرے طریقوں سے بھی حق تلفیاں برتی گئیں
مثلاً یہ کہ وہ مسلمان آبادیاں جن پر غیر مسلموں نے قبضہ یا تسلط غاصبانہ
کرلیا۔ حق حکومت خود اختیاری سے محروم رکھی گئیں جس وقت ایک طرف
یہ تمام واقعات پے در پے وقوع پذیر ہو رہے تھے عین اس وقت اسلام
ہندلی رائے عامہ کی" جسکی آواز صلح کانفرنس تک تو مطلقاً نہیں پہنچنے
دیگئی اور خود اتحادیوں کے کانوں تک پہونچی تھیں تو ان مسلمانوں کے حلق
سے جو سرے سے ہمارے نمائندے ہی نہ تھے زبان بندی ہندوستان
میں ان مہیب آلات سے کی گئی جن کے اصطلاحی نام پریس ایکٹ، ڈفنس
آف انڈیا ایکٹ ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء ہیں اور پھر آخر میں عام تعزیری
قانون کے علاوہ ہندوستان کے بعض مقامات پر مارشل لا کا نفاذ۔

اتحاد و اتفاق کے لیے موزوں وقت

میں ابھی اپنا خیال ظاہر کرچکا ہوں کہ مسلمان حکومتوں اور آبادیوں کے
ساتھ دشمن کے تلخ تجربات مسلمانوں ہی کے اس خیال کے پھیلنے میں معین
ہوئے کہ اس غیر مسلم و غیر ملکی حکومت سے اس کی خاطر ہر ممکن قربانی کرنیکے
بعد بھی ہمدردی اور معاونت کی توقع رکھنا ایک خام خیال ہے بلکہ اگر

مسلمانوں کو کسی کی معاونت درکار ہے تو ہندوستان کی دیگر اقوام کے ساتھ
اشتراک عمل کا پائدار اور بااصول معاہدہ کرنا چاہیے مشرقی بنگال کے معاملہ
میں بھی جبکہ مسلمانوں کے ساتھ غداری کی گئی یہی راہ عمل ان کے لیے باقی
رہ گئی تھی ۔ یہ وقت گویا ہندو مسلم اتحاد کی تجدید کے لیے نہایت موزوں تھا۔
سچے اشتراک عمل اور رفاقتِ کار کا چاہیے وہ تجارت میں ہو یا معاشرت
میں یا محبت میں ۔ اصول یہ ہے کہ فریقین جو ایک دوسرے کے تجارت معاملت یا
دوستی میں شریک ہونا چاہتے ہیں ان کے باہم زیادہ فرقِ حالات نہ ہو۔
بعینہٖ یہی حالت سیاسیات میں ہے امیر و غریب بوڑھے اور نوجوان عالم اور جاہل
میں اتحاد عمل اگرچہ شاید ممکن ہے لیکن معمول کے خلاف ضرور ہے۔ اسی بنا پر
سید احمد خاں کا خیال صحیح تھا کہ انھوں نے ایک نسل پہلے قوی اور ضعیف کو ایک ہی ساتھ
چلانے کی مخالفت کی تھی لیکن اس بحث کے دوران میں جو منٹو مارلے کے اصلاحات
کے متعلق پیدا ہو گئی تھی مسلمانوں میں کسی حد تک خودشماری کا احساس پیدا
ہو چلا تھا جو سیاسیات میں ایک ضروری اور اہم صنعت ہے ۔ لیکن جنگ طرابلس
کے شروع ہونے کے وقت ہی سے مسلمانوں کو گورنمنٹ کی استبدادی پالیسی
کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا ۔ میں مسلمانوں کی تعریف کی غرض سے نہیں بلکہ واقعی
کہتا ہوں کہ اس سارے پُرفتن زمانے میں مسلمانوں کے ڈبل کوچ کر کر کے
اس فاصلے کو جو ان کے اور ہندوستان کے دوسری ترقی یافتہ اقوام میں
حائل تھا ایک بڑی حد تک طے کر لیا ۔

مفاہمت

نظربندی کے زمانہ میں ہم دونوں بھائیوں کی رائے سے ہی ۱۹۱۰ء میں
مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں منعقد کیا گیا جہاں اس سال کانگریس کا اجلاس

ہونے والا تھا۔ مولانا مظہر الحق صاحب بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گیے مولانا آپ کے کانگریس اور مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ہیں جنہوں نے باوجود اس امر کے کہ مسلمانوں کی جماعت کا حصہ غالب سید احمد خان کی تیس سال قبل کی پالیسی سے سر مو تجاوز کرنا نہ چاہتا تھا۔ کانگریس سے اپنا قطع تعلق نہ کیا۔ چنانچہ مولانا مظہر الحق صاحب سے خواہش کی گئی کہ وہ کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی لیڈروں کا ایک جلسہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے آیندہ سیاسی تعلقات کو مضبوط اور درست کرنے کی غرض سے منعقد کریں۔ مسٹر جناح کے موثر وکالت صدر نشین لیگ کے زور بیان اور شمشیر بے نیام مسلمان وطن دوست مولانا حسرت موہانی کی جرات و استقلال کے مجموعی طاقت سے آخر کار وہ مفاہمت ہو ہی گئی جس کا ثمرہ اگلے سال لکھنؤ کے تاریخی میثاق کی شکل میں ملنے والا تھا۔

مسلمانوں کی رضاؤ ترقی اس قدر تیز تھی کہ ایک ظریف نے جو خود بھی مسلمان ہی تھا کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں کے خطبوں کو پڑھکر جو رائے دی اس کا مختصر اعادہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بمبئی کے بنگالی صدر لارڈ سنہا اور ان کے بھاری ہمسایہ اور قانون پیشہ بھائی جو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی کے صدر تھے۔ یہ ارادہ سفر بمبئی ایک ہی گاڑی میں سوار ہوئے راستے میں دونوں نے ایک دوسرے کا خطبہ صدارت دیکھنے کے لیے مانگ لیا۔ تاکہ باہم کر توسیع خیالات کریں لیکن خوبیٔ وقت و اتفاق سے دونوں ایک دوسرے کا خطبہ پڑھکر واپس کر نا بھول گئے چنانچہ مولانا مظہر الحق نے مسلمان آراکین مسلم لیگ کے روبرو وہ گرما گرم اور تیز و تند خطبہ پڑھ دیا جو بنگالیوں کا ہی حصہ تھا۔ اور لارڈ سنہا نے کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کے

سامنے وہ نرم اور پُر از احتیاط و حزم خطبہ پڑھا جو ہمیشہ سے وفادار مسلمانوں کے شایان شان تھا۔ گورنمنٹ اب سمجھنے لگی تھی کہ بمبئی کے اس مفاہمت باہمی کے کے ناگزیر نتائج کیا ہوں گے چنانچہ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ اراکین مسلم لیگ جنہوں نے اپنے اجلاس کا آغاز اس بلند آہنگی سے کیا تھا آخر میں مجبور ہوئے کہ اس کا اختتام بند کمرے میں کریں اس کے بعد سے کانگریس و مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر ہونے لگے اور دونوں جماعتیں باہمی اعانت سے کام کرنے لگیں۔ نتیجہ ناگزیر اور پہلے سے معلوم تھا۔ اگر کانگریس کے اجلاس احمد آباد کا صدر بجائے اس کے کہ احمد آباد میں صدارت کی کرسی پر بیٹھا ہو علی پور کے جیل میں بند تھا۔ تو اس سال کے مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر بھی احمد آباد میں اپنے خطبہ صدارت کی بدولت بادشاہ کے خلاف جنگ کرنے کے جرم میں ماخوذ تھا اور جب جوری کے متفقہ فیصلے نے اسے اس جرم سے بری کر دیا تو بغاوت کے جرم میں سزایاب ہو کر احمد آباد کے جیل میں قید کر دیا گیا۔ یہ مسلم کلاہ تفاخر میں ایک طرۂ امتیازی ہے کہ جب سرجیت داس بنگال اور دوسرے مقامات میں سوراجیوں کے گروہ کو فتح و ظفر کی منزل پر پہنچا رہے ہیں ان کا مسلمان ہمکار یرودا جیل میں مہاتما گاندھی کی رفاقت کا فخر حاصل کر رہا ہے . . .

اور باوجود اس کے کہ جیل میں ارتکاب جرائم کے مواقع مسدود ہوتے ہیں اپنی قید کی میعاد بجائے کچھ حصہ جھیل چکنے کے دُگنے سے بھی زیادہ بڑھا چکا اور اس طرح سے جوری کی غلطی کی تصحیح کر چکا۔

وسیع تر ہندوستانی حقوق کے متعلق مسلمانوں کا احساس

لیکن صرف اتنی ہی بات نہ تھی کہ مسلمان بغیر اس کے عمر بھر غیر ملکی حکومت ہی پر بھروسہ

کرتے اور ہمسایہ اقوام کے طرف سے شکوک وشبہات دل میں رکھتے رہیں خود اپنے قومی مفاد کے تحفظ کا اہتمام اپنے ہی اوپر لازم سمجھیں۔ بلکہ مسلمانوں پر المسان کا اطلاق صحیح نہ ہوتا اگر وہ ان مظالم پر جو ہند واہل ہند پر مجموعاً مسلسل جاری تھے۔ انہیں اپنے سیاسی استادوں کا پڑھایا ہوا یہ سبق اب تک یاد تھا کہ سرکار بالآخر شکایت کا دفعیہ کر ہی دیتی ہے۔ اس لیے وہ اب تک اسی پر تکیہ کیے بیٹھے رہے اس انتظار کو ایک مدت گزر چکی لیکن ان مظالم کی تعداد میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اور مرہم کی جگہ چرکے اور کچوکے ہی سہتے رہے۔ انتظار کے تلخ تجربہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد کانگریس کے ممبروں میں سالانہ بڑھنے لگی۔ اور یہ صورت حال اس حقیقت کی ایک امید افزا دلیل تھی کہ اب ان میں نہ صرف اپنے محدود جماعتی اغراض بلکہ وسیع تر ملکی و وطنی اغراض (جن میں دوسری ہندوستانی قومیتوں کے ساتھ خود یہ بھی شریک تھے) کے تحفظ کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ اب ان پر یہ امر پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہو چلا ہے کہ مسلمان ہونیکے یہ معنی نہیں کہ وہ دائرۂ ہندوستانیت سے خارج ہیں۔ کلکتہ بمبئی اور دہلی کے اجلاس کانگریس حقیقی معنی میں "کانگریس" کے لقب کے مستحق ہونے لگے لیکن یہ فخر جنرل ڈائر ہی کے حصہ میں آیا کہ جو دیوار سرسید احمد خاں نے بتیس سال قبل ہندوں اور مسلمانوں کے درمیان کھڑی کی تھی وہ اب کلیتہً مسمار ہو گئی اور مسلمانوں نے امرتسر کانگریس ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی قومیت کے مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے شرکت کی۔ جنرل ڈائر کے سپاہیوں کی گولیوں نے ہندو مسلمان میں تفریق نہ کی۔ اور مشیت الٰہی نے اس خوبصورتی کے ساتھ ترتیب واقعات دی کہ ہمارے دلادر سکھ بھائیوں نے بھی جو مسلمانوں سے بھی زیادہ وفاشعار

تھے، اپنے مذہبی مرکز کی مقدس زمین کو ہندو اور مسلمان شہیدوں کے خون کے ساتھ رنگین کیا۔

مہاتما کا ورود

لیکن جلیانوالا باغ میں جو مصائب برداشت کئے گئے تھے، ان کی حیثیت محض انفعالی تھی، نہ وہ از خود پیدا کئے گئے تھے نہ ہنسی خوشی برداشت کیے گئے بلکہ حکام کے مارشل لا (فوجی قانون) کی کارفرمائی ہے جو دہشت دلوں میں بیٹھ گئی تھی، اس سے تو ایک وقت میں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ پنجاب میں اشتراک مظلومیت نے جو احساس اتحاد و اشتراک پیدا کر دیا ہے، کہیں "معًا" مردہ ہو کر نہ رہجائے۔

لیکن یہ رنج وغم صرف پنجاب کے لیے مخصوص نہ تھا۔ متعدد محبان وطن ہندوستانی پنجاب گئے لیکن مجکو یقین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کو اپنی کسرشان نہ خیال کریں گے اگر میں کہوں کہ ان اہم ایّام کا سب سے اہم واقعہ مہاتما گاندھی کا ورود پنجاب تھا۔ مہاتما کی سرگذشت آپ لوگوں کو رتی رتی معلوم ہے اور اب تو لفضلہ ہندوستان سے باہر بھی باخبر حضرات اس سے واقف ہیں اس لیے مجھے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جنوبی افریقہ میں جو تجربے اُن کو ہوئے اُن سے اس کو یقین ہو گیا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ بیرون ہند انصاف نہیں کیا جاسکتا جبتک کہ خود اپنے وطن میں ان کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے۔ اور خود ہندوستان کی حکومت اُن کے ہاتھ میں نہ آئے لیکن اس کے یہ معنی نہ تھے کہ خواہ مخواہ برطانوی تعلق کو بالکل خیرباد ہی کہد یا جائے۔ اور آج بھی نہ صرف جنکی رواداری ضرب المثل ہو گئی ہے بلکہ ان کے خدام کا بھی مثل میرے جو ان کی سی رواداری کا ہرگز مدعی نہیں

یہ یقین ہے کہ گذشتہ چند سالوں کے تلخ تجربات کے باوجود ہندوستان کا بہترین سوراج برطانوی تعلق کے قیام کے ہرگز منافی نہیں بشرطیکہ برطانوی سرکار اور برطانوی قوم اپنے قلوب کی اصلاح کرلیں اور اپنے اعمال گذشتہ کے کفارہ پر آمادہ ہوجائیں۔ چنانچہ مہاتماجی کی واپسی وطن اسی غرض سے ہے کہ وہ ہندوستان کو اخلاقی و سیاسی غلامی سے نجات دلائیں۔

لیکن جن طریقہائے کار کو وہ پسند فرماتے تھے اور جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے پیروؤں کو کی، ان پر سیاسیات زدہ مغرب کے نقطۂ خیال سے "سیاسی" کا اطلاق ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ تمام بڑے ہادیان عالم کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ زندگی بجائے خود ایک احد تنظیم کا نام ہے۔ خواہ فلسفیانہ مطالعہ کی اغراض سے اسکی کتنی ہی تحصیل اجزا کیجائے اور سیاسی و روحانی حیثیات میں کوئی نسبت تناقض نہیں

حضرت مسیح اور بنی اسرائیل۔ ایک تاریخی تشبیہ

بہت سے لوگوں نے مہاتماجی کی تعلیمات اور پھر ان کے مجاہدات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات و ریاضتوں سے تشبیہ دی ہے لیکن لوگوں کا خیال ابتک جہانتک پہنچا ہے، یہ تشبیہ حالات اس سے بھی آگے پہونچتی ہے حضرت عیسیٰ قوم یہود سے تھے اور ان کے معتقدین کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ خاندان داود کے مسیح ہیں جو بنی اسرائیل کو ان کی گم گشتہ آزادی و اقتدار واپس دلانیکو مبعوث ہوئے ہیں۔

اس وقت سے بنی اسرائیل انتقام اور تلافی مافات کا خواب برابر دیکھ رہے تھے اور سائرس کی فتح سے ایکبار ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ اب انکی تمام امیدیں پوری ہو رہی ہیں۔ معبد کی دوبارہ تعمیر شروع ہوگئی تھی۔ اور کچھ عرصہ کے وقفہ کے

بعد کام پھر جاری ہو گیا۔

زیرو بابل جو حضرت داؤد کی نسل میں تھا۔ حجّی اور زکریا بن ادّو کا سرمایۂ امید تھا۔ جو "ان اقوام کی سلطنتوں" کے مٹ جانے کے بعد یہودیوں کی سیاسی زندگی کی توقع رکھتے ہیں۔ حضرت داؤد کے نسل کی تلافی معلوم ہوتا تھا کہ زیرو بابل کی ذات واحد کرے گی۔ اور اس طرح سے پہلے انبیاء کے متعلق مسیحی پیشنگوئیاں پوری ہوئیں۔ لیکن پیشنگوئی اس وقت پوری نہ ہوئی۔ اور زیرو بابل کا پتہ نہ چلا۔ جو تاجپوشی کے ساتھ حضرت زکریا میں غائب ہو گئے انھوں نے کبھی بھی اصلی تاج نہ پہنا۔ اور نہ اپنے آباد اجداد کے تخت پر بیٹھا۔

بنی اسرائیل کی قسمت میں اب کبھی آزادی کا مزہ چکھنا نہ تھا۔ لیکن خواہ وہ یونانیوں کے جوئے تلے ہی ہوں۔ یا رومیوں کے" بنی اسرائیل نے عروج ثانی کی امید کبھی نہ چھوڑی "ایشیا میں یونانی اور رومی تمدن کے فاتحانہ اور اکثر ظالمانہ ترویج اسکو پھر وہی خواب دکھلائینگی۔

ہیرود اعظم۔ جس نے روم سے کسی قدر آزادی بھی حاصل کر لی تھی اسی سال فوت ہوا جس سال حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اور اسکے تین بیٹے رومیوں کے اسی طرح ادلین سردار تھے جس طرح انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہندوستان کے راجا ہوتے ہیں۔"

(رینان) حضرت عیسیٰ کے زمانہ طفولیت میں ارکیلاس کو اگسٹس نے تخت سے اتار دیا۔ اور یروشلم کی رہی سہی آزادی بھی جاتی رہی۔

یہودیہ اسوقت سے صوبۂ شام کا جو ایک شاہی نائب کے زیر حکومت تھا ایک ریاست کا جزو بن گیا۔ بہت سے رومی حاکم جو خاص امور میں شام کے شاہی نائب کے ماتحت ہوتے تھے اور جس میں سے تاریخ عیسوی میں

پانطس پلاطس بہت مشہور ہے، ہمیشہ اس آتش فشاں کے دبانے کی فکر میں رہا کرتے تھے جو ان کے پیروں تلے سلگ رہا تھا اس تمام عرصہ میں بعض موسوی مذہب کے پرجوش لوگوں نے مسلسل بغاوتیں کیں جن سے یروشلم میں بے چینی بڑھتی رہی رومی Eagle کو اور ہیرودیس کی تعمیر کردہ عمارتوں کو تباہ کرنے پر جس میں موسوی قوانین کا ہمیشہ لحاظ نہیں کیا جاتا تھا ان کی نظریں جو دنیا کے تمام تفکرات سے مستغنی تھے ہمیشہ لگی رہتی تھیں اس قسم کی دوسری تحریکوں سے سامریوں میں ہی ایک جوش سا پھیلا ہوا تھا۔ "Zelotes" یا "Sicarie" جنہوں نے ہر اس شخص کو قتل کرنے کا جو ان کے خیال میں قانون شکنی کرتا بیڑا اٹھایا تھا اب ظاہر ہونے لگے جس تحریک کا حضرت عیسیٰ پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ یہودا گلیلی کی تھی مردم شماری جس پر ٹیکس کی تمام تر بنیاد تھی بہت ہی قابل نفرت خیز سمجھی جاتی تھی پس مردم شماری نے جو سنہ عیسوی کے چھٹے سال ہو رہی تھی Galilee سے رومی حکومت کی نفرت کو دوبارہ تازہ کر دیا تھا۔ اور اس سے ایک بڑا جوش پھیلا ہوا تھا واقعہ یہ ہے کہ شمالی صوبوں میں جہاں یہودیوں کے بڑے بڑے کارنامے وقوع پذیر ہوئے ایک انقلاب عظیم برپا تھا لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قیامت اب قریب آگئی ہے اناجیل جنکی مختلف تاویلات ہونے لگی تھیں بڑی بڑی توقعات دلاتی تھیں پرانے عہد نامے (توریت) کی سطر سطر میں وعدہ نظر آتا تھا اور ایک طرح سے آئندہ حکومت کا پروگرام دکھائی دیتا تھا جس میں نیکوں کو امن ملیگا اور خدا کا کام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا" (رینان)

حضرت عیسیٰ کا اخلاقی انقلاب

جب حضرت عیسیٰ نے ابتدائے بعثت کے وقت دنیا کا اندازہ لگایا تو انہیں پہلے یہ سوال پیش آیا کہ اصلاح کا طریقہ کون اختیار کریں۔ ارکان کلیسا کے خیال کے مطابق تشدد سے اصولی اختلاف کے باعث، اور میرے علیحدہ خیال

کی رو سے وقتی و ملکی مصالح کی بنا پر انھوں نے بنیاد کار اس عقیدہ کو رکھا کہ بدی
کا مقابلہ نہ کیا جائے یہ الفاظ دیگر انھوں نے تشدد کو "استعانت بالصبر" سے شکست
دینی چاہی جیسا کہ حضرت امام حسینؓ نے بعد کو میدان کربلا میں کیا تھا گو تلوار مرتے دم
تک ہاتھ سے نہ چھوٹی لیکن حضرت عیسیٰ کے طریقہ اصلاح کو خواہ ہم کسی نقطۂ نظر سے
دیکھیں اسمیں شبہ نہیں کہ ان کے اصولی خیالات اس عہد کے سیاسی مصلحتیں جیسے
یہود سے بالکل مختلف تھے جنکی ہر طرف بغاوتیں پھیلانے والی تدبیر کی بے اثری
ان پر روشن ہو چکی تھی۔ اگر واقعی حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ کہا بھی کہ "میری بادشاہت
اس دنیا کی نہیں ہے" تو اس سے اُن کا منشا صرف یہ رہا ہوگا کہ وہ شیطان کو "جو اس
دنیا کا بادشاہ ہے" شیطانی حربوں سے شکست نہ دینگے۔ وہ اپنے احکام
و تدابیر میں "دنیوی" نہ تھے لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ "دوسری دنیا کے
متعلق" تھے۔ اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ "دنیا سے بے تعلق"
تھے۔ سیاسی انقلاب خواہ کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب ابتدائے بعثت ہی
میں ٹھکرا چکے تھے اور اسی پر آخر تک قائم رہے جس قسم کا انقلاب وہ پیدا کرنا
چاہتے تھے وہ ایک اخلاقی انقلاب تھا اور اگرچہ ان کا حشر بھی "باغیوں"
کا ہوا اور پلاطوس کے حکم سے وہ صلیب پر "یہودیوں کے بادشاہ" کے لقب سے
لٹکائے گئے جو اگرچہ طنزاً کہا گیا تھا۔ لیکن اس طنز سے رومی حاکم کے سیاسی شبہات
کا بھی پتہ چل رہا ہے حضرت مسیح کے نزدیک آزادی کے معنی حق اور تزکیہ نفس
تھا۔ رینان میرے خیال کے مطابق اپنے زمانہ کا ایک ایسا فرانسیسی شخص تھا جسکی
نظر میں حکومت کے مطالبات سب پر بالا تھے اور وہ حضرت عیسیٰ کی مذہبی تعلیمات
کو محض بندہ خدا (عبداللہ) کہتے تھے۔ وہ نہ تو سمجھ سکتا تھا اور نہ ان کی داد دے سکتا
تھا لیکن میں رینان کے اس خیال سے متفق ہوں کہ "بحیثیت ایک خشک جمہوریت

پسند یا پرجوش محب وطن کے انھوں نے حالات حاضرہ کی رو کو نہیں روکا۔ البتہ یہ اعلان کرکے کہ سیاست ایک حقیر چیز ہے، انھوں نے دنیا پر یہ ظاہر کردیا کہ ملک ہی ہمارا اولین و آخری مقصد نہیں اور انسان کا مرتبہ شہری سے مقدم اور بلند تر ہے"۔ جذبہ انتقام جسکی آگ بنی اسرائیل کے دلوں میں سلگ رہی تھی، اس کا حق صرف خدا ہی کو سزاوار ہے۔ حضرت عیسیٰ نے ان لوگوں کو جو آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" (العین بالعین والسین بالسین) کا قانون رکھتے تھے یہ تعلیم دی کہ وہ جس کے گال پر ایک طمانچہ مارا جائے۔

اُسے چاہیے کہ مارنے والے کی طرف دوسرا گال بھی پھیر دے یہ برتاؤ تو غیر ملکی ظالم فرمانروا کے ساتھ رکھنے کا تھا۔ باقی خود اپنے ہموطنوں کے لیے جو اپنی ہی کمزوریوں کا شکار بن کر اور یہودیہ کے غیر ملکی حاکموں کے خوف سے، ان کی جانب سے تحصیل وصول وغیرہ کی خدمات ملازمت قبول کر چکے تھے۔ سو ان کے لیے تو حضرت مسیح کا وسیع دامن راحت کشادہ تھا ہی۔ صبر و تحمل کے ذریعہ سے غلبہ حاصل کرنے اور تزکیہ قلب کے ذریعہ تشدد پر فتح پانے کا خیال ابتدائے انسانیت یعنی ہابیل اور قابیل کے زمانے کا ہے لیکن چونکہ یہ اصول اُن حالات کے ساتھ جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں موجود تھا۔ ایسا چسپاں ہوگیا تھا کہ باوجود اسکے کہ ان کے حالات نبوت ہم تک بہت ہی ناقص حالت میں پہنچے ہیں، تاہم یہ جزو اب تک تفصیل کے ساتھ محفوظ چلا آتا ہے یہانتک کہ اکثر عیسائی اور بہت سے غیر عیسائی بھی اُن تعلیمات کو حضرت عیسیٰ کی ساتھ مخصوص سمجھنے لگے ہیں۔

حضرت عیسیٰ اور مہاتما گاندھی

خیر وہ جو کچھ بھی ہو مہاتما گاندھی سے بھی اسے ایسی ہی نسبت مخصوص حاصل ہے
لیکن یہ شرف مخصوص ایک عیسائی حکومت ہی کے حصہ میں تھا کہ اس نے ہمارے
زمانہ کے سب سے بڑے مسیح نما شخص کے ساتھ ایک مجرم کا سا برتاؤ کیا
اور اس شخص کو جو پبلک زندگی میں "شاہ امن" سے سب سے زیادہ قربت
رکھتا ہے ایسے شخص کو امن عامہ کا برہم زن قرار دیکر سزا دی۔ ہندوستان
کے سیاسی حالات مہاتماجی کے ورود سے پیشتر بالکل ویسے ہی تھے جیسے
یہودیہ کے بعثت مسیح سے قبل تھے اور جو نسخہ انھوں نے ہندوستان کے
امراض کے لیے انتخاب کیا، وہ وہی تھا جو اس سے قبل حضرت عیسیٰ نے
یہودیہ کے لیے منتخب کیا تھا۔ "استعانت بالصبر" کے ذریعہ سے تزکیہ نفس،
حکومت کی ذمہ داریوں کے لیے اخلاقی تیاری اور سوراج سے قبل ضبط
نفس مہاتماجی کا عقیدہ مسلک جو کچھ کہیئے یہی تھا۔ اور جن لوگوں کو اس مبارک
سال میں رہنا نصیب ہوا ہے جو احمدآباد کانگریس کے ساتھ ختم ہوا،
انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مہاتما نے انسانوں کی اتنی بڑی
آبادی کے اعمال، جذبات اور خیالات میں کس قدر حیرت انگیز اور فوری
تغیر پیدا کر دیا تھا۔

مہاتماجی اور ستیہ گرہ

مہاتما گاندھی کا ساتھ سرکار ہند کے ساتھ براہ راست رہ چکا ہے، اکثر
والسرائے کو مشورہ دیتے رہے ہیں اور جنوبی افریقہ میں ضرورت کے وقت
برطانوی حکومت کی اعانت بحیثیت اعزازی افسر ہندوستان میں بھرتی کرتے

رہے بلکہ اس پر ان لوگوں کو حیرت بھی ہوئی تھی، جو مہاتما کی زندگی جو بجائے خود "کوہ زیتون کا وعظ" تھا اور خون آشام سپاہیوں کی بھرتی میں کوئی مناسبت نہیں پاتے تھے لیکن سرکار سے ایسا وفادار اور ایسا بڑا دوست بھی مجبور ہوا کہ اسی حکومت کے قانون کی مخالفت کرے جبکا کوئی شخص جو ہندوستانی وفاداری کے ترانے قبل از جنگ برطانیہ کی زبان سے سنتا رہا ہے خیال تک بھی اس میں نہیں لاسکتا کہ اس کا نتیجہ جنگ کے بعد یہ ہوگا۔ ایک اسکیم اصلاحات زیر غور تھی، جسکے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ اس سے ہندوستانی حکومت میں ہندوستانیوں کے حقوق کا مزید اضافہ ہوگا لیکن جبکہ ایک ہاتھ کے متعلق خبر تھی کہ وہ ہندوستان میں حق انتخاب کو وسیع کرے گا دوسرا ہاتھ اسکی رہی سہی آزادی کے غصب کرنے میں مصروف ہو گیا اس کے متعلق میرے بھائی اور میں نے لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے کی خدمت میں چھنڈواڑہ سے ۲۴ اپریل سنہ ۱۹۱۹ء کو عین اسوقت جبکہ قانون تحفظ ہند کی خلاف ورزی کر کے، جس نے چار سال ہمکو نظر بند کر رکھا تھا، ہم عنقریب جیل میں داخلہ کی تیاری کر رہے تھے حسب ذیل تحریر کیا۔

"جنگ اب ختم ہو گئی ہے لیکن ظلم کی روح جو ایسی جنگ سے پیدا کی اب بھی باقی ہے، اور جبکہ ایک طرف بڑے بڑے شاندار الفاظ میں یہ اعلان کیا جارہا ہے کہ جو لوگ آج پیرس میں دنیا کی قسمتوں کا فیصلہ جبر و تشدد کے اصول پر نہیں بلکہ مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر کرنے بیٹھے ہیں، وہ رعایا کے آقا نہیں ایکے خدام ہیں، دوسری جانب گورنمنٹ ہندوستانیوں کو ان کے اہم ترین مسائل پر اظہار خیال سے روک رہی ہے۔ یہی نہیں کہ اب تک ہماری زبان بندی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس سے کہیں زیادہ عظیم الشان آلہ خدا کی ۳۰ کروڑ

سے زیادہ یا زبان مخلوق کی زبان بندی کے لیے تیار کیا گیا ہے رولٹ بل نے
جو ابھی جبراً طور پر پاس کیا گیا ہی، قانون کی حکمت کو ختم کر دیا ہے اور اسکی بجائے
خوف و دہشت کی حکومت قائم ہو گئی ہے اور اگرچہ ہندوستان کا ہر طبقہ
اس سے متاثر ہے لیکن مسلمان سب سے پہلے اور سب سے بڑی طرح شکار ہوں گے۔ قانون
مطابع سے سب سے زیادہ نقصان مسلم پریس نے اٹھایا اور اگر بنگال کے
وہ بدنصیب نوجوان خارج کر دیے جائیں جو تیرہ و تار کوٹھریوں اور جزائر میں بلا
سماعت مقدمہ رہائی سے مایوس پڑے ہوئے ہیں تو قانون تحفظ ہند کا بھی یہی نتیجہ
ہوا۔ جو لوگ کہ خوش آیندہ توقعات رکھتے ہیں اور امید کے خلاف امید کرتے ہیں
کہ دفتر شاہی حکومت باوجود دیو کی طاقت رکھنے کے بھی اسے دیو کی طرح
جبر و تشدد کے ساتھ استعمال نہ کرے گی۔ انہیں چاہیے کہ ہمارے تجربے
پر نظر ڈالیں تاکہ ان کی غلط فہمی رفع ہو جائے۔ ہمیں حکام کی مصلحت شناسیوں"
اور "افسران تحقیقات" کا جو بند کمرہ میں بیٹھکر غیر متعین الزامات کی نمائشی تحقیق کرتے
اور بغیر کسی قانون شہادت یا ضابطہ کے خفیہ مد شہادتیں" لیتے اور دور از کار
خفیہ رپورٹ پیش کرتے ہیں اور اخیر میں نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ان کا یہ تکلیف کرنا ان کی عدم
واقفیت کیوجہ سے بے سود ثابت ہو جاتا ہے کافی تجربہ ہے اور ہم دعوی
کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ بلیک ایکٹ عملاً اس کے مرادف ہے کہ نوع انسانی
کی آبادی کے پورے پانچویں حصہ کو دائرۂ قانون و آئین سے خارج کر دیا جائے۔
جس وقت مہاتما گاندھی نے اپنی مشہور تحریک ستیہ گرہ شروع کی تو ہم نے رولٹ
بل کی اصلی معنی اور اسکی حقیقت اُن پر واضح کر دی یہ ترک موالات کے نانے
کی ابتدا تھی۔ اُس زمانہ میں دہلی، امرتسر، لاہور، اور احمد آباد کے فسادات
اب تاریخ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اور اگرچہ مہاتما جی کا یہ اعتراف کہ انہوں نے

"ہمالیہ جیسی عظیم غلطی" کی تمام دنیا میں گورنمنٹ کے ذریعہ سے مشتہر کر دیا گیا۔
اور سرکاری وغیر سرکاری لوگوں نے جو گورنمنٹ کے دوست تھے اس کام میں اُس کی
مدد کی، لیکن کسی میں اتنی ایمانداری نہ تھی کہ وہ یہ بھی تسلیم کرتا کہ اگر مہاتماجی اس
وقت اپنی قوم کو آزادی کی خاطر متحد نہ کر دیتے تو یہ غلطی ہمالیہ کی سب سے
بڑی چوٹی کوہ ایورسٹ سے بھی اونچی پہنچ جاتی ۔ زیادہ سے زیادہ
یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہاتماجی کی یہ "ہمالیہ جیسی عظیم غلطی" صرف اس قدر تھی کہ
کہ انھوں نے لوگوں کے صبر و استقامت اور ضبط نفس کا اندازہ غلط کیا تھا
لیکن اگر مہاتما گاندھی قانون رولٹ کے خلاف آواز نہ اٹھاتے تو وہ ایک ایسے
گناہ کے مرتکب ہوتے جس کے کفارہ کی کوئی صورت بھی نہیں نکل سکتی۔ غضبناک
مجمعوں کا سارا تشدد ایک طرف رکھو اور دوسری طرف ان قوانین کے ذریعہ
سے جو غلامی قوم کو دیجا رہی تھی اُسکو خاموشی سے برداشت کرنے کی نامردی
کو رکھو تو میں کہتا ہوں کہ باوجود اس کے کہ اس قوم کی تشدد سے مجھے
دلی نفرت ہے، پھر بھی میں یہ پسند کروں گا کہ قیامت کے روز عرش الٰہی
کے نیچے میں اس تشدد کے مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوں بہ نسبت اس کے
کہ نامردانہ اطاعت کے ناگفتہ بہ جرم کا مرتکب سے قرار پاؤں۔ ان الفاظ
سے میں یہ چاہتا ہوں کہ آج سے چار برس قبل کے واقعات پر خود اپنے سردار
مہاتماجی کے اُس قول سے مطابقت دوں جو انہوں نے عدالت میں
اُس جج کے سامنے رکھے تھے جس نے ان کو چھ سال کے لیے گویا زندہ
درگور کر دینے کا حکم دیا۔ مہاتماجی نے فرمایا تھا۔ کہ میں جانتا ہوں کہ میں
آگ سے کھیل رہا تھا،" لیکن انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "میں آزاد کر دیا جاؤں
تو پھر بھی یہی کروں گا" جس طرح اپنے طریق کار میں وہ حضرت مسیح کے مثل نظر آتے

اسی طرح وہ آخر تک رہے انھوں نے دیدہ دانستہ یروشلم جانے کا قصد کر لیا تھا اور صلیب کا خوف بھی اُن کو اپنے فرض کے راستے پر چلنے سے نہ روک سکا۔

عدم تشدد

میں اس موقع پر امن و شانتی کے متعلق ان لوگوں کا طرز عمل جن میں میں خود شامل ہوں دوبارہ بیان کر دوں میں عیسائی نہیں ہوں جن کا عقیدہ ہے کہ بدی تک ہر قسم کی مقاومت گناہ ہے۔ اور اگر اصولاً نہیں بھی تو عملاً تو ضرور تمام عیسائی اور عیسائی حکومتیں میرے ساتھ ساتھ اتفاق کلی رکھتی ہیں گذشتہ جنگ نے تمام عیسائیوں اور حکومتوں کے لیے عیسائی اصول عدم مقاومت کے اظہار کا نہایت عمدہ موقعہ بہم پہنچا دیا تھا لیکن ہمیں معلوم ہے کہ کسی حکومت نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور تھوڑے سے عیسائی جن کے قول اور فعل میں تضاد نہ تھا وہ تھے جنہیں ضمیر کے فتوے کی بنا پر شرکت جنگ سے انکار تھا ان کی تحقیر، تمسخر اور توہین کی گئی اور مجرموں کی سی سزائیں دی گئیں صرف یہی نہیں ہوا بلکہ ہر قومی کلیسا نے قومی جھنڈے کو حرکت دی اور قومی سپاہیوں کو اسطرح رخصت کیا جیسے وہ صلیبی جہاد پر جا رہے ہیں ایک مسلمان اور حضور خاتم المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت ہونے کی حیثیت سے میرا یہ اعتقاد ہے کہ لڑائی بری چیز ہے لیکن ساتھ ہی میرا یہ بھی اعتقاد ہے کہ لڑائی سے بھی زیادہ بری چیزیں ہیں۔ قرآن کریم میں وارد ہے لا اکراہ فی الدین (کہ دین میں جبر و اکراہ نہیں) اس لیے کہ جبر اور معتقدات مذہبی میں قدر مشترک ہے ہی نہیں یوں کہنا چاہیے کہ دونوں کے میدان الگ الگ ہیں لیکن لڑائی اگر مجبوراً کسی کے سر پر آ پڑے اور جس فریق نے ابتدا کی تھی اس کے خاموش کرنے کو سوائے اس کے برہان ہے نہ ہو تب میں بحیثیت مسلمان اور حضور خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کے پیچھے نہ ہٹوں گا اور دشمن سے اس

کے میدان میں لڑکر اسی کے ہتھیاروں سے اسے شکست دوں گا اگر جبر کے سوا اور کسی دلیل کی اس میں وقعت ہی نہیں ہے اور اسے وہ میرے مقابلے میں استعمال کرتا ہی تو میں اپنے مذہب کو اس کے حملوں سے بچاؤں گا اور اپنی تمام طاقت اس کے خلاف استعمال کروں گا لیکن جب لڑائی ختم ہو باصطلاح قرآنی لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے حتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا تو میری تلوار بھی نیام میں چلی جائیگی جیسا میں کہہ چکا ہوں لڑائی بری چیز ہے مگر قرآنی صراحت کے مطابق فتنہ وفساد لڑائی سے بھی بدتر ہے وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ اور لہذا اس آگ کو لڑائی کے ہتھیاروں ہی سے فرو کرنا چاہیے جب فتنہ وفساد ختم ہوجائے اور ہر شخص آزاد ہو کہ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ جو چاہے تب جنگ کا خاتمہ ہوجانا چاہیے جہاں تک میرا محدود علم ہے اسلام میں سختی کے لیے حدود انتہائی بھی ہیں اور میں قانون الٰہی کے خلاف ورزی کیے بغیر ان حدود سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ لاکن میں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ ملکر کام کروں میں اپنی ذاتی حفاظت کے لیے بھی تشدد کا استعمال نہ کروں گا میں نے یہ معاہدہ بخوشی خاطر اس لیے کیا ہے کہ ہم بغیر تشدد کے فتح حاصل کرسکتے ہیں اتنی بڑی قوم کو جس کی تعداد تیس کروڑ ہو تشدد کا استعمال نہایت ذلت کی بات ہو سب سے زیادہ یہ کہ فتح طبقوں کی فتح نہیں ہوسکتی بلکہ صرف جنگجو طبقہ کی فتح قرار پائے گی اور دوسرے ممالک کے برخلاف ہندوستان میں جنگجو طبقہ باعتبار قومیت دوسرے طبقوں سے بالکل جداگانہ ہے ہمارا سوراج دراصل تمام قوم کا راج ہونا چاہیے اور ایسا ہونیکے بعد یہ ضرور ہے کہ سوراج سب لوگوں کے متفقہ قربانیوں ہی سے حاصل ہوا ہو اگر ایسا نہیں ہوا تو اس سوراج کے قائم رکھنے کے لیے ہمیں جنگجو فرقوں کی شجاعت ہی پر بھروسہ کرنا پڑے گا اور یہ ہمیں ہرگز نہ کرنا چاہیے سوراج ہمیں زیادہ سے زیادہ افراد کی کم سے کم ایثار کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیئے کہ کم سے کم افراد کی زیادہ سے زیادہ قربانیوں سے چونکہ مجھے پرامن ترک موالات کے تعمیری پروگرام کی طاقت پر پورا اعتبار اور بھروسہ

ہے لہذا مجھے تشدد کے لیئے بے چین ہونیکی مطلق ضرورت نہیں اگر یہ بفرض محال پروگرام
ہمیں کامیابی نہ بھی دلائیگا تب بھی وہ مصائب جو خوشی کے ساتھ برداشت کیجائیں آگے چلکر
تشدد کے موثر استعمال کے لیے بھی بہترین تیاری کا کام دیں گی لیکن انشاءاللہ تعمیری
پروگرام ناکام نہ ہوگا بشرطیکہ ہم عزم بالجزم کے ساتھ کام کریں اور قوم کو اس تھوڑی سی
ایثار و قربانی کا خوگر بنادیں جو ناگزیر ہو۔

سوراج قوم سے کیا چاہتا ہے

اس جگہ میں اپنے ان برادران وطن سے جوان چھوٹی چھوٹی قربانیوں کے برداشت
کرنے سے بھی جی چراتے ہیں یہ دریافت کروں گا کہ آیا انھوں نے یہ بھی سوچا ہے
کہ جب ایک سپاہی جنگ میں شریک ہونے کے لیے نکلتا ہے تو وہ کون سی چیز ہے جسکو قربان
کرنے کے لیے وہ تیار ہوتا ہے جیسا کہ انجیل میں ہے ”کوئی شخص اس سے زیادہ
محبت کا اظہار نہیں کرسکتا کہ وہ اپنے دوست کے لیے اپنی جان قربان کردے
خود ہمارے پندرہ لاکھ ہم وطن ایسے معاملے کے لیے جو انکا اپنا نہ تھا آخر میدان
جنگ میں گئے ہی تھے۔ تب کیا ہم جو اپنے احساس قومی کے قوت پر اسقدر ناز کر
کرتے ہیں اُن چھوٹی چھوٹی قربانیوں سے بھی جی چرا سکتے ہیں جن کا مطالبہ ہم سے پرامن
ترک موالات کرتا ہے؟ لیکن اصل حقیقت سننا چاہو تو مجھ سے سن لو کہ ہمارا موجودہ
پروگرام تو قومی جدوجہد کے محض ابجد ہی ہے اور سوراج جب حاصل ہوگا تو وہ تو
سپاہی کے سرفروشی سے بھی زیادہ قربانی کا طالب ہوگا۔ کسی مقصد کے خاطر جان
دینا کچھ بہت مشکل نہیں ہر زمانے اور ہر ملک میں لوگوں نے جانیں دی ہیں بلکہ اور
اکثر نے تو بہت ہی معمولی باتوں کے پیچھے دی ہیں جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں کسی مقصد
کے لیے جان تک دیدینا تو کچھ بہت مشکل کام نہیں زیادہ مشکل یہ ہے کہ کسی مقصد کے لیئے
زندہ رہا جائے اور اگر ضرورت ہو تو تکلیف و مصیبت برداشت کیجائے اور وہ

مقصد جس کے لیے ہمیں زندہ رہنا اور تکلیفیں اور مصیبتیں اُٹھانا چاہیے ہندوستان میں خدائی حکومت کا حصول ہے۔

تارکین موالات اور اُن کے مخالفین کے تشدد کا موازنہ

جب میرے دلی اعتقادات یہیں تب میں ان لوگوں کی سرخ چشمی اور دلیری پر تعجب کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو کہتے ہیں کہ ہم ملک کو تشدد۔ خونریزی اور بدامنی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ہم جو اُن کے اور تشدد کے درمیان دیوار آہن کا کام دیتے ہیں خدا کی شان کہ وہ ہمیں سے عدم تشدد کے متعلق ضمانت چاہتے ہیں حالانکہ خود انہیں کے ہاتھ جلیانوالہ باغ کے بے گناہوں کے خون سے سرخ ہیں۔ ایسا خون جس کے متعلق ابھی تک نہ اظہار ندامت ہی نہ انتقام اس کھلی ریاکاری کا اُس بے لاگ صفائی سے مقابلہ کرو جو ہمارے سردار نے چورا چوری اور بمبئی کے ہنگاموں کی پوری ذمہ داری اپنے سر لیتے میں ظاہر کی تب تمہیں ترک موالات اور اُس کے پیرو و مخالفین کے اخلاقی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو جائے گا اس مسیحی گورنمنٹ نے مہاتما جی کے اعتراف کو تو ساری دنیا میں مشتہر کر دیا۔ لیکن حضرت عیسیٰ کے حواری پیٹرس نے رومی سپاہی ملکوس کا کان جو کاٹ ڈالا تھا معلوم نہیں کہ گورنمنٹ اُس کی ذمہ داری کو بھی زیتون کے وعظ کے سر بھی عائد کرنے کو تیار ہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ "شہزادہ امن" کے پیروؤں کی خونریزیاں کتنی زائد ثابت ہوتیں اگر ان کے آقا کو اسلحہ شماری کے وقت دو تلواروں سے زیادہ ملتیں یا اس کے دوسرے پیرو پیٹرس مذکور سے زیادہ ثابت قدم ثابت ہوتے جس نے حسب روایت انجیل ، مرغ صبح کی بانگ سے قبل تین مرتبہ حضرت مسیح کا انکار کیا جب چوری چورا اور اوسی کے مثل دوسرے ناگوار واقعات پر حکم لگایا جائے تو انہیں واقعات کو خیال نہ کرنا چاہیے جو ظہور پذیر ہوئے بلکہ وہ سب کچھ بھی جس

نظر ہونا چاہیے جو روک دیا گیا۔ اس سے قبل ہندوستان کی تاریخ میں کبھی بھی
لوگوں میں اسقدر فوجی احساس پیدا نہیں ہوا تھا جس طرح ترک موالات کی ابتدا سے
ان میں پیدا ہو گیا ہے یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ عوام کے غضب کا نتیجہ خونریزی
ہوا بلکہ تعجب تو اس کا ہے کہ ہندوستان کی مردانگی اسقدر کم خونریزی سے
دوبارہ زندہ ہو گئی ہے میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ کوئی تمام انسانیت
کی تاریخ میں ایسا واقعہ تبلا دے کہ کروڑوں انسان اپنی آزادی کے
برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہوں اور اسقدر پرامن رہے ہوں
جس طرح مہاتما گاندھی کی زیر کردگی اہل ہند رہے یورپ
کا ملک ایسا نہیں جہاں ان حالات کے درمیان باوجود وہاں
کے باشندوں کے خون میں حرارت نہ ہونے کے خون کا سیلاب
نہ رواں ہو جاتا ہندوستان میں جو طوفان نہ برپا ہوا اس کے
خاص سبب مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا رکار کا رویہ ہے

موالات

عدم تشدد پر بحث کرتے ہوئے میں موضوع سے علیحدہ جا پڑا
اب میں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ امرتسر کانگریس میں
میں سب سے زیادہ اہم تجویز اصلاحات کے متعلق تھی اور
اگرچہ اس اجلاس کو صرف چار سال ہوئے۔ اکثر لوگوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا
کہ اس تجویز پر جب مباحثہ ہوا تو اس میں میرے دوست ولیش بندھو داس
جو اسوقت داخلہ کونسل کے لیڈر ہیں اور میرے سابق سردار لکمونیا تلک
موالات کے قطعاً مخالف تھے اور خود مہاتما گاندھی نے اس تجویز پر ترمیم پیش کی تھی

اس تجویز کا منشا یہ تھا کہ شاہی اعلان میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہو اس کے مطابق کانگریس اصطلاحات کو کامیاب بنانے میں حکام کا ساتھ دے۔ فریقین میں سے کوئی بھی دوسرے کی بات ماننے کو تیار نہ تھا اور جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہو کہ سبجکٹ کمیٹی کے بحث و مباحثے کی طوالت کی وجہ سے اجلاس کانگریس میں تاخیر ہو رہی تھی اور جلسوں کی تاریخیں بھی بڑھتی جاتی تھیں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کانگریس میں حصہ لیا۔ اور ایک مبتدی کی حیثیت سے میرا حصہ بھی بالکل ناقابل التفات نہیں۔ میں نے اور میرے بھائی نے ایسا گر تلاش کیا جس کو مہاتما گاندھی اور لوکمانیہ تلک اور دیش بندھو داس دونوں منظور کر لیں۔ بالآخر ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ اور مسٹر بجت مین چندر پال نے ایک ترمیم پیش کی جس کی تائید میں نے کی تھی اور جس میں کانگریس کو یہ منظور کرنے کی سفارش کی گئی کہ "قانون اصلاحات کی دفعات کا استعمال ہندوستان میں جلد از جلد ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے کیا جاوے"۔ اس طرح مخالفت رفع کی گئی اور فریقین نے اس تجویز کی تائید کا اقرار کیا کہ جہاں تک ممکن ہو کانگریس اعتماد کرتی ہو کہ اصلاحات پر اس طرح عمل درآمد کیا جاویگا کہ جلد از جلد کامل ذمہ دار گورنمنٹ قایم کی جا سکے۔

اس ترمیم کے بعد کانگریس نے یہ تجویز منظور کی جس کی تحریک دیش بندھو داس نے کی اور تائید لوکمانیہ تلک نے کی۔ اس تجویز میں ہندوستان کو ذمہ دار حکومت کا اہل بتلایا گیا، اصلاحات کے متعلق صاف کہا گیا کہ وہ محض ناکافی، ناقابل اطمینان اور مایوس کن ہیں اور نیز اصول خود اختیاری کے مطابق پارلیمنٹ سے تقاضا کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں کامل ذمہ دار حکومت قایم کرنے کی کارروائی جلد عمل میں لائے۔ میں نے یہ تفصیلی باتیں ظاہر کرنے کو دہرائی ہیں کہ امرتسر تک میں مہاتما گاندھی اور ان کے رفقاء کا رجہاں تک ممکن ہو وہاں تک موالات کرنے کو تیار تھے۔ لیکن تاہم اس کانگریس میں ہوا کا رُخ بالکل بدلا ہوا تھا اور اپنی قوم سے ایک بڑی مدت کی جدائی کے بعد میں اس تبدیلی سے اثر پذیر ہوئے۔

بغیر نہ رہ سکا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی پرانی دشمنی اور رقابت معدوم ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کے رفیق اور بھائیوں کی طرح ہو گئے تھے۔ پیشتر سے تیار کردہ تقریروں کا جوش اب باقی نہ رہا تھا۔ وہ تقریریں جن کے تیار کرنے میں آدھی رات کے چراغ کا تیل استعمال کیا گیا ہو۔ اور "جو صرف آواز اور غیظ و غضب سے لبریز ہوں اور جس کو شرمندۂ معنی ہونے کی نوبت نہ آئے۔"

لوگوں میں ایک نئی مستعدی اور سرگرمی پائی جاتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس کی تجویزیں واقعی تجویزیں ہیں کیونکہ قوم نے ان پر عملدر آمد کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان میں آدمیوں کے ڈر سے مرعوب ہو کر لوگ کسی کام کے کرنے کو مجبور نہ ہوں گے بلکہ آئندہ سے اس سرزمین کے باشندے صرف اللہ کا خوف ماننے والے ہوں۔ اس تعجب خیز تبدیلی نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ امرتسر میں میں نے اپنی تقریر میں اپنے اک ہم وطن کا یہ شعر پڑھا:۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی!

موالات سے ترک موالات تک

یہاں تک لوگوں کے مزاج اور نقطۂ نظر میں تبدیلی وقوع پذیر ہوئی تھی۔ ان کے طرز عمل میں بھی عظیم الشان انقلاب ہونیوالا تھا۔ اور مہاتما گاندھی نے جو امرتسر میں لوگوں کے گورنمنٹ کے ساتھ موالات کی حمایت میں مصر تھے سب سے پہلے ترک موالات کی تعلیم دی۔ کون سی چیز تھی جس نے ان کے طرز عمل کو یکسر تبدیل کر دیا؟

میں اعتراف کرتا ہوں کہ دوران جنگ میں اور خاص کر ۱۹۱۸ء کے آخر میں التوائے جنگ کے بعد سے میرے خیالات اس گورنمنٹ کی طرف سے بالکل تبدیل ہو گئے۔

اب جب کہ میں "کامریڈ" کی فائلوں کو اُٹھا کر پڑھتا ہوں اور اُن توقعات کو جو نہ صرف
۱۹۱۱ء کے شروع ہونے تک بلکہ ۱۹۱۴ء کے اختتام تک میں نے عام طور پر ظاہر کیں تھیں تو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ کسی ایسے جانور کی جواب بالکل معدوم ہے وہ ہڈیاں ہیں جو حال میں دستیاب
ہوئی ہیں۔

یہ درست ہے کہ دسمبر ۱۹۱۹ء کے آخر تک گورنمنٹ سے موالات کرنے کے متعلق میرا رویہ
درمیانی شخص کا تھا کہ ایک طرف مہاتما گاندھی اور دوسری طرف دیش بندھو داس اور لوکمانیہ تلک
تھے اور بالآخر پوری کانگریس نے یہی رویہ اختیار کیا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے موالات کے ممکن
ہونے کی اُمید نہ تھی جو نتیجہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے موالات کرنے میں حاصل ہوا تھا۔ وہ سب مجھے
بخوبی معلوم تھا۔ جلیانوالا باغ گلی جس میں لوگوں کو رینگنے کو مجبور کیا گیا اور جلیانوالا کے
ڈاک بنگلہ کے تمام واقعات میرے پیش نظر تھے غیر مسلسل اور ہنگامی یا اتفاقی واقعات یا اُن کو ناعاقبت
اندیش حکام کے غصہ پر محمول نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ مسلسل واقعات اس اندرونی مرض کے ظاہری
آثار تھے جس کی یہ غیر ملکی دفتر شاہی گورنمنٹ شکار تھی۔ مجھ کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ ایسے طریقہ
حکومت کے لئے یہ بیماری بالکل طبعی ہے اور اگر یہی طریقہ حکومت جاری رہا تو ایسے واقعات برابر
ظہور پذیر ہوتے رہیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلسل جلیانوالا باغ کے واقعات کا نام گورنمنٹ
رہ جائیگا تاوقتیکہ برطانیہ کے طرز عمل میں بڑی تبدیلی نہ واقع ہو۔

جب ڈیوک آف کناٹ ۱۹۲۱ء میں اصلاحی مجالس واضع آئین کا افتتاح کرنے کے لئے تشریف
لائے تو ہم سے اپیل کی کہ گزشتہ کو فراموش کر دیں اور معاف کر دیں۔ میں معاف کرنے کے
لئے اُس وقت بھی تیار تھا اور اب بھی تیار ہوں لیکن میں گزشتہ کو کیونکر فراموش کر سکتا ہوں۔
اور نہ میں فراموش کرنا چاہتا ہوں۔ اس شخص کے نزدیک جو ابھی خواب سے بیدار ہوا ہے
فراموش کرنا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ دوبارہ خواب گراں میں مبتلا ہو جائے اور خوش آیند
خواب دیکھا کرے جو وہ ناگوار حقائق کے معلوم ہونے سے قبل دیکھا کرتا تھا۔ لیکن مہاتما گاندھی

کہ اعتقاد ان تمام باتوں پر مبنی سمجھتا تھا اور اُن کے خیالات میں تبدیلی اور بعد کو ہوئی۔

امرتسر کانگریس کے کئی ماہ بعد تک وہ اسی امید میں رہے کہ شاید انگلستان کی طرف سے اظہار تاسف ہو، خلافت کی آزادی اور اقتدار برقرار کیا جائے۔ اور جزیرۃ العرب کا تخلیہ ہو، اور انگلستان کی طرف سے اُس ظلم کی تلافی کی جائے جو پنجاب کے لوگوں کے ساتھ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کو یہ توقعات ہی نہ تھیں بلکہ ان کا تو یہ پکا عقیدہ تھا اور آخر کار اُن کے بھی آنکھیں کھل گئیں۔ اور جب وہ تعمیری پروگرام تیار کر رہے تھے تو اُن کو بھی انگلستان کے نیک ارادوں کے متعلق مطلقاً اعتماد باقی نہ رہا تھا اور جب ہم ان سے کہتے تھے وہ حد سے تجاوز کر رہے ہیں تو وہ اپنے طرزِ عمل کی یہ کہہ کر حق بجانب قرار دیتے تھے کہ چونکہ اُنھوں نے حال ہی میں اپنے خیالات تبدیل کیئے ہیں اس لیئے لازمی طور پر ان میں جوش زیادہ ہونا چاہیئے۔ جب مسلمانان ہند نے وفد خلافت کے توسط سے اپنی آخری عرضداشت انگلستان کے روبرو پیش کی تو اسی سلسلہ میں ہم لوگوں کی جو ملاقات رائٹ آنریبل ڈیوڈ لائڈ جارج سابق وزیر اعظم انگلستان سے ہوئی اس سے ظاہر ہوگیا کہ اپیل کرنا محض بیکار ہے۔ اور جب پنجاب کے مظالم کو "رائے کی غلطی" زیادہ وقعت نہ دی گئی مزید براں ہندوستان کے معصوم سپوتوں کے قاتلوں اور اس صریح ظلم کے جائز رکھنے والے سنگدل حاکم کے لیئے مفلس ہندوستانیوں کا پیٹ کاٹ کر پنشن بطور انعام منظور کی گئی ہو ایسے شخص کو جو گورنمنٹ ہاؤس کی محفوظ چار دیواری میں چین اڑاتا جس کے چاروں طرف مسلح سپاہ کا پہرہ ہر وقت موجود رہتا ہو اور جو جنرل ڈائر کی طرح اپنی صفائی بھی نہ پیش نہ کر سکتا۔ انہی واقعات کی بنا پر مہاتما گاندھی کا حاکم و محکوم کے مابین موالات کا پُرانا اعتقاد جاتا رہا۔

ترکِ موالات

ترک موالات کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اگر اب بھی ہمارے مخالفین یا

یا دوستوں میں سے کسی نے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا ہے تو میں یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ ترک موالات کی اہمیت اس خطبۂ صدارت میں ان کے ذہن نشین کر سکونگا۔

اس لیے میں صرف اسقدر کہنے پر اکتفا کرونگا کہ مختصراً ترک موالات سے مراد یہ ہے کہ اگر ہم برائی کو نہ روک سکیں تو کم از کم اس کی معاون بھی نہ بنیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم کو اس بات کی توقع ہے کہ اگر ہندوستانی قوم اس ایثار و قربانی کے لیئے تیار ہو جائے جو ترک موالات سے لازم آتی ہیں تو یہ غیر ملکی گورنمنٹ بالکل بے کار ہو جائے۔ اور اگرچہ ہم اپنے نتیجہ کی توقع نہیں کرتے ہیں لیکن یہ صورت محض بطور واقعہ پیش آ جاتی ہے۔

اگرچہ ہماری تحریک کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ منفی حیثیت رکھتی ہے لیکن واقعی ایسا نہیں۔

ہماری تحریک دراصل اثباتی تحریک ہے اور اس کا اصل مقصد یہ نہیں کہ دوسرے تباہ ہو جائیں بلکہ اس کا منشا اپنی تباہی کو رفع کرنا ہے۔ ترک موالات کے پروگرام کی ہر دفعہ جس کا میں ابھی ذکر کرونگا اپنے اندر تعمیری اور ایک تخریبی پہلو پنہاں رکھتی ہے۔ اور ہمارا بننا یا بگڑنا ہمارے ہی تعمیر یا عدم تعمیر پر منحصر ہے اگر ہم نے تباہ نہ کیا یا دوسرے الفاظ میں اگر ہم ان تمام چیزوں سے برابر مستفید ہوتے رہے جو گورنمنٹ نے اپنے بقا کے لیے تعمیر کی ہیں اور ہماری تباہی کے لیے ایک ادنیٰ معمولی تنخواہ دار پہرے دار رات کو چین کی نیند سوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ پہرے کا وقت اونگھتے ہوئے کاٹ دیتے ہیں لیکن ہر آدھ گھنٹہ کے بعد تمام جیل دو بھلا رے بھلا کی آواز سے جو قیدی پہرہ دیتے وقت چلاتے ہیں گونج اٹھتا ہے۔ اور یہ آواز جیل کے ہر گوشہ سے دہرائی جاتی ہے اور جبتک یہ آواز سنائی دیتی رہتی ہے تنخواہ دار چوکیدار ایک نیک انسان کی نیند سوتا ہے حضرات موالات کی بھی بس ایسی ہی مثال ہے ہم اپنی آزادی کھو چکے اور ان دوسروں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جو خود بھی آزادی سے ایسے ہی محروم ہیں جسطرح ہم سوائے چند ذرا ذرا سے حقوق کے جو ان کو حاصل ہیں ایسی حالت میں وہ چند غیر ملکی باشندے جو ہمکو غلامی میں گرفتار کیے ہوئے ہیں آرام اور چین

کی نیند سو لیتے ہیں چونکہ وہ جو کہ ہمارے ساتھ غلامی میں شریک ہیں ہندوستان کے عظیم الشان جیل خانہ سے وقتاً فوقتاً بھلا ہی بھلا کی آوازیں لگاتے ہیں ۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ اسطریقہ سے وہ قیدی جو چوکیدار اوورسیر اور وارڈر ہیں بمقابلہ ان قیدیوں کے جن پر وہ پڑھ دیا کرتے تھے اپنی رہائی قیدخانہ سے کچھ جلد حاصل کرلیں گے لیکن ہمارے موالاتی دوست جو خود بھی ہمارے ساتھ غلامی میں شریک ہیں ہمارے بمقابلہ میں جلد غلامی سے رہائی کی بھی توقع نہیں رکھ سکتے ایک جال بنایا ہے تو اس حالت میں بگاڑ دینگے بلکہ ہمارا وجود ہی نہ رہے گا ۔ اگر ہمارا اصلی مقصد گورنمنٹ کو تباہ و برباد کرنا ہی تھا تو بھی یہ خلاف اخلاقی تعلیم کے مطابق ہے نیز حضرت مسیح اور اس موجودہ زمانہ میں مہاتما گاندھی کے اصول محبت کے مطابق ہے ۔ اور میرا اتبک ہی خیال ہے کہ گورنمنٹ کو بیکار محض کردینا بالکل ممکن ہے دوستو! مرغ قفس کی حیثیت سے جب کہ میں شروع شروع پھنسا تھا تو ہندوستانی جیلوں کے طرز موالات کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا ۔ ہر ماہ کے آخر میں ہر قیدی کے چند دن اس صلہ میں چھوڑ دیے جاتے ہیں کہ اُن کا رویہ قابل اعتراض نہ تھا ۔ او مقامی حکام جیل جس شخص پر مہربان ہوں اس پر اعتماد کرتے ہوں تو اسکو چوکیدار ، قیدیوں کا اوورسیر یا قیدیوں کا وارڈر مقرر کردیتے ہیں قید کے ایام میں دیگر حقوق حاصل ہونیکے علاوہ ان لوگوں کے ہر ماہ زیادہ دن چھوڑ دیے جاتے ہیں ۔ اس پنڈال میں ہر وہ شخص اور یقیناً اس پنڈال میں اُن کی تعداد کافی ہے جو آزادی کے اُس دروازہ سے گذر چکا ہے جسکو عرف عام میں قیدخانہ کہتے ہیں قیدیوں کے اوورسیر اور وارڈروں کے فرائض کی انجام دہی سے بخوبی واقف ہوگا جو شب کو تنخواہ دار پہرے داروں کے ساتھ جو منتظمین جیل کیطرف مقرر کیے جاتے ہیں پہرہ دیتے ہیں فی الحقیقت ان کو تو غلامی کا احساس تک باقی نہ رہا اور وہ انہیں زنجیروں کو جو انہیں غلام بنائے ہوئے ہیں دل سے لگا رہے ہیں میں نے جیل میں اس مضمون پر یہ شعر کہا تھا ۔

چھوڑ میری فکر غافل رو خود اپنی قید پر حسکو تو زیور سمجھتا ہے وہی زنجیر ہے

مسلمانوں سے ایک سوال

دوستو! مجھے یقین ہے کہ میں نے آپ لوگوں کو اور خود اپنے آپ کو بھی اس مبسوط
تاریخی بیان سے پریشان کر دیا ہے جسکی ابتدا غدر سے ہوئی اور جو ہمارے زمانہ کے تحریک
ترک موالات پر ختم ہوا اس گذشتہ تاریخ بیان کرنے سے میرے پیش نظر ایک خاص مقصد ہے
میں ایک مطلق العنان کی حیثیت آپ حضرات کے سامنے نہیں اختیار کر رہا ہوں تاہم میں آپ سے
اتحاد عمل کا خواہاں ہوں نہ مہاتما جی کیطرح میری کوئی شخصیت ہے اور نہ میں آپ
پر اپنا جادو چلانے کا خواہش مند ہوں اور نہ میں اسکی قابلیت ہی رکھتا ہوں
میں صرف ان نتائج کی طرف آپ کی رہنمائی کر سکتا ہوں جن پر اپنی نصف عمر کی گمراہی
اور بہت سی غلطیوں کے بعد میں اب پہنچا ہوں میں آپ کے سامنے یہ کہکر پیش
کرسکتا ہوں کہ گذشتہ چند پشتوں کا تجربہ بھی جو ہمارا حقیقی رہنما ہے انہیں نتائج
کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے ہماری جد و جہد کی یادگار ہمارا تجربہ
ہونا چاہیئے کیونکہ یہ یادگار ان ہتھیاروں سے تعمیر کیگئی ہے جنہوں نے
ہمیں زک دیئے اور اس جگہ میں اپنے ہم مذہب بھائیوں کے تجربہ سے
اپیل کروں گا کیونکہ وہ اس راستہ سے جسکی رہنمائی ان کی گذشتہ ساٹھ سالہ تاریخ
نے کی ہے نہایت مستعدی کے ساتھ ہٹائے جا رہے ہیں

ہم نے مانا کہ ترک موالات قطعاً ناکام رہا اور اپنے غیر مسلم اہل وطن
کے ساتھ موالات موہوم امید اور وہم سے زیادہ وقیع نہیں گو یہ میں فقط
دلیل کی خاطر مان رہا ہوں ورنہ میں اسے تسلیم نہیں کرتا ہوں۔

با ایں ہمہ ہمکو کوئی چارہ کار اور جدید طرز عمل تجویز کرنا ہے۔ میں ان سے
یہ نہیں کہتا کہ وہ میری سرکردگی کو قبول کریں بلکہ خود میرے رہنما بنیں ۔

اب یہ سوال ہے کہ وہ میری رہبری کس طرف کر سکتے ہیں۔
اگر اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ ترک موالات اور دوسرے مذاہب کے ہندوستانی غلام بھائیوں کے ساتھ معاونت ناممکن ہے تو آخر ہمارے سامنے آج کون سا چارہ کار چھوٹتے ہیں کیا ہم الٹے ترقی کرنا شروع کر دیں تا کہ چاروں ہاتھ پاؤں سے چلنے لگیں۔؟
کیا ہم اپنے غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ موالات کریں اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ بیشتر کی طرح لڑائی شروع کر دیں؟ اور اگر ہم نے ایسا کیا بھی تو جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے تصفیہ کے بعد جو نتائج پیش آئے کیا اب ہم اون سے زیادہ بہتر کی امید کر سکتے ہیں؟ یا گھر کے قریب ہی کی مثال لو یعنی بنگال جہاں طے شدہ" معاملہ پھر دوبارہ فیصل کرنا پڑا۔
بہنیں بھائیو! اُس دفتر کا تو ورق الٹ گیا اور اب ہم اسکی طرف لوٹ کر نہیں دیکھ سکتے۔ تمہارے یا میرے پاس اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ ہم غیر ملکی سے ترک موالات کریں اور اپنے پڑوسیوں سے موالات کریں۔ اور ناممکن باتوں سے پریشان ہو کر وقت ضائع کرنا فضول بات ہے۔

مسٹر مانٹیگو کا استعفیٰ اور اسکی اہمیت

کہا جاتا ہی کہ لوزان صلح کے بعد اب ہماری کوئی شکایات باقی نہیں رہیں۔ آپ حضرات مجھ سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوں گے کہ یہ صلح کیونکر ہوئی کیونکہ میں اس زمانہ میں ڈیڑھ سال کی قید بھگت رہا تھا اور اس تمام عرصہ میں پبلک معاملات سے بالکل بے تعلق رہا۔ لیکن میں نے اخبارات کے کچھ پچھلے پرچے اٹھا کر دیکھے ہیں جن سے ان اسباب کا پتہ چلتا ہی جن سے عہد نامہ سیورے پر اسی زمانہ میں نظر ثانی کی گئی، جبکہ میں جیل ہی میں تھا۔ آپ اس تاریخی تار سے بھی واقف ہوں گے جو گورنمنٹ ہند کی طرف سے مقامی حکومتوں اور وزراء سے مشورے اور عام رائے لینے کے بعد سکرٹری آف اسٹیٹ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ اس معاملہ میں غالباً مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ تار مسلمانوں کے جذبات و حسیات تو درکنار احکام اسلامی کو پوری طرح پر ظاہر نہیں کرتا تھا۔ اس میں جزیرۃ العرب کے تخلیہ کے متعلق کوئی ذکر نہ تھا" اس میں صرف مقامات مقدسہ پر سلطان کے حکومت کی سفارش کی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہی کہ گورنمنٹ ہند نے بلاشبہ اس کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہی کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی توقعات کو بہ تمام و کمال پورا کرنا ناممکن ہی" گو مسٹر چیمبرلین کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ "شرائط ترکوں کے بڑے سے بڑے دوستوں کے مطالبات سے بھی کہیں بڑھ کر تھیں" باوجود ان سب کے ایسے تار کے شائع کر دینے پر بھی دنیا نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک عجیب و غریب تماشا تھا۔ وزیر اعظم کی جانب سے سکرٹری اف اسٹیٹ کے استعفے کا مطالبہ کیا جاتا ہی اور ملک معظم نہایت خوشی کے ساتھ اس کو منظور فرما لیتے ہیں" گویا دوسرے الفاظ میں مسٹر مانٹیگو نہایت ذلت کے ساتھ برخاست کر دئے گئے جیسا کہ ریوٹر کے تار سے معلوم ہوا کہ "دار العلوم میں مسٹر چیمبرلین کا اعلان یونینسٹ کی کثرت تعداد کی طرف سے خیر مقدمانہ نعرۂ تحسین کے ساتھ سنا گیا اور بالخصوص استبدادی تو خوشی سے پھولے نہ سمائے" ریوٹر کے ایک دوسرے پیام سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ "اس سے پیشتر

کبھی بھی دار العوام خوشی کے نعروں سے اس قدر نہ گونجا، جتنا مسٹر مانٹیگو کے استعفے سے۔ یہ نعرہ یونینسٹ کی بنچ سے اٹھا لیکن اس قدر بلند تھا اور اتنی دیر تک قائم رہا کہ نعرۂ عام معلوم ہوتا تھا۔ بعض پرجوش لوگوں نے اپنے رومال تک ہلائے" مسٹر مانٹیگو کی پارٹی کے متعلق جس پر ان ہندوستانیوں کی امیدوں کا دارومدار ہے جو اب بھی اس خیال پر قائم ہیں کہ آزادی غیروں کے ہاتھ سے بطور تحفہ مل سکتی ہے، سب سے ہمدردانہ ذکر ریوٹر کے کسی ابتدائی پیام میں یہ تھا کہ "لبرل اور مزدور پیشہ جماعت کے ممبروں نے بلا کسی اظہار رائے کے اس خبر کو سنا" آج شاید یہ کہا جا سکے کہ گورنمنٹ مسلمان لیڈروں کی طرح ان مسائل کے جو مسلمانوں اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان ہیں، کسی اطمینان بخش فیصلہ پر پہونچنا چاہتی ہے۔ لیکن اس سے ہمارا کیا فائدہ جب تک کہ گورنمنٹ ہند "چھ ہزار میل دور حکومت برطانیہ کی ایک ماتحت شاخ" رہیگی اور گورنمنٹ ہند کا حکومت برطانیہ سے یہ کہنا" کہ ان معاملات میں اُسے یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے لارڈ کرزن کیلئے "قطعی ناقابل برداشت" ہے۔ یہی لارڈ کرزن نے مسٹر مانٹیگو کو بھی اُن کے برخاست کرنے کے وقت لکھا تھا اگرچہ بیچارے مانٹیگو نے صرف یہ خیال کیا کہ انھیں تنبیہاً علحدہ کر دیا گیا لیکن بظاہر وہ بھول گئے تھے کہ ڈین شومی میں ان پر تازیانے بھی پڑیں گے اور پھانسی بھی دی جائے گی اور یہ کہ لارڈ کرزن کی آخری عدالت پر یہ اعتماد کیا جائے گا کہ اس جیسی مجرم کو نہ صرف تنبیہ بلکہ پھانسی بھی دی جائے۔

کوئی ایماندار مسلمان جو ہماری گورنمنٹ کے ساتھ ترک موالات اور ہم وطنوں کے ساتھ موالات کرنے سے ناراض ہے دیانتداری سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ برطانیہ نے ہندو مسلمانان کے جذبات کا ذرہ برابر خیال کیا۔ تاہم آپ ذرا سنیئے کہ اس سے قبل ہندوستان کے وائسرائے اور جو ۱۹۰۵ء میں بنگال کے معاملہ میں مسلمانوں کے مربی بنتے تھے پندرہ سال کے بعد ہم ماتم زدوں کی چیخ پر کیا ارشاد فرماتے ہیں۔ اپنے ایک خط بنام مسٹر مانٹیگو وہ رقمطراز ہیں:" ان مسلسل واقعات میں ہندوستان نے جو حصہ لیا ہے یا جس قدر حصہ لینے کی اجازت دی گئی ہے وہ میری

فہم سے بالاتر ہے۔ کیا مسلمانوں کی اپیل کی آخری دارالقضا ہندوستان کی رائے عامہ ہی ہے"؟

مسٹر مانٹیگو نے اپنے حلقہ انتخاب کیمبرج میں تقریر کرتے ہوئے کہا "صلحنامہ سیورے میں گورنمنٹ ہند کی بھی ایک فریق کی حیثیت تھی۔ اگر اس صلحنامہ سے واقعی اگر امن قائم ہوجاتا تو گورنمنٹ ہند اس کو بلا تامل منظور کر لیتی لیکن جب اس کے بعد یہ ظاہر ہوا جیسا کہ میرا خیال تھا کہ اس سے امن وصلح ہرگز نہیں قائم رہ سکتی تو گورنمنٹ ہند نے اس صلحنامہ پر نظر ثانی کی درخواست کی۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا کناڈا جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کی گورنمنٹیں خاموش بیٹھی رہتیں جبکہ نام نہاد صلح سے خود ان کے اندرون ملک میں امن وصلح برباد کی جارہی ہو"؟

بیچارہ مسٹر مانٹیگو کس آسانی سے یہ فراموش کرگئے کہ کناڈا مغربی افریقہ اور آسٹریلیا قومی حکومتیں ہیں اور گورنمنٹ ہند جس کی صدارت لارڈ ریڈنگ باوجود مسٹر مانٹیگو کے مستعفی ہوجانے کے فرما رہے ہیں ہرگز قومی حکومت نہیں کہی جاسکتی۔ برخلاف اس کے گورنمنٹ ہند وہ ہے جس نے چھ سال کے لئے ہندوستان کے سب سے مقتدر لیڈر کو جو کئی نسلوں کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا قیدخانہ میں بند کر رکھا ہے۔ اس امپیریل گورنمنٹ کے دباؤ کی وجہ سے جس نے اس معاملہ میں اس کے خیالات کی تائید کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ ڈاکٹر سپرو نے بھی ہندوستان اور نوآبادیات کے درمیان اس بین فرق کو فراموش کردیا تھا اور امپیریل کانفرنس میں آخر آئرلینڈ کے ایک نمائندہ کو اس امر کی یاد دہانی کرانا پڑی۔ مسٹر مانٹیگو نے اپنی کیمبرج والی تقریر میں جو حوالہ دیا ہم نے بھی ان سے یہی کہا تھا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہ نکلا اور اس مسئلہ میں ہماری وکالت کو تعزیری قانون کے ماتحت قابل سزا قرار دیا گیا حالانکہ اس سے قبل سابق وزیر ہند ہی اس کی حمایت کرچکے تھے چاہے وہ ناکام ہی رہی ہو۔ اس موقع پر جو لوگ مجھ سے مسٹر مانٹیگو کی ہمدردی کے

مستعفی کہتے تھے میں ان سے کہتا تھا کہ ان کی ہمدردی سے اب تک کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ مسٹر مانٹیگو کی آخری برطرفی سے قبل متعدد مواقع ایسے درپیش ہوئے جب ان کو مستعفی ہو جانا چاہیئے تھا اور اب وہ خود اپنے متعلق کہتے ہیں۔ "میں متعدد بار مستعفی ہونے والا تھا لیکن میں نے صرف اس لیے تامل کیا کہ میں مسلمانان ہند سے یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ وہ وعدے جو ان سے کیے گئے تھے کالعدم ہو گئے"

باوجود اس کے ان کو مستعفی ہونا پڑا اور آج وہ نہ صرف یہ کہ گورنمنٹ میں نہیں بلکہ دارالعوام میں بھی نہیں۔ کیا ہم اس سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ "وہ وعدے جو ہم سے کیے گئے تھے کالعدم ہو گئے"

لیکن نہیں! وہ کالعدم نہیں ہو سکتے۔

دوستو! اللہ کے بھروسہ پر اور تمہاری مدد سے ہم اُن کو دوبارہ حاصل کریں گے یا اسی جدوجہد میں فنا ہو جائیں گے۔

لوزان میں انگلستان

یہ تو مارچ ۱۹۲۲ء کی حالت تھی، اور اگرچہ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی رائے کا پورا لحاظ کیا جائے گا لیکن میں آپ سے انگلستان کی اُس رویہ پر غور کرنے کی درخواست کرتا ہوں جب کہ چھ مہینے کے بعد بہادر ترکوں نے، برطانوی وعدوں پر نہیں بلکہ خدا کے فضل و کرم اور اپنی قربانیوں اور جسارت پر بھروسہ کرکے، برطانیہ کے وحشی ساتھیوں کو سمندر میں ڈھکیل دیا۔ آپ سب صاحبان کو مجھ سے بہتر علم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس کے متعلق آپ کا زیادہ وقت لوں۔ انگلستان نے میدان جنگ میں شکست کھانے کے بعد اب یہ چاہا کہ کانفرنس کے موقع پر اپنی چالبازی سے ترکوں کو ثمرات فتح سے محروم کردے۔ لیکن یہاں بھی اللہ نے اُسی کی مدد کی جس نے خود اپنی مدد کرنا چاہی اور عہدنامہ لوزان نے یہ ثابت کردیا کہ ترک صرف سپاہی ہی نہیں بلکہ وہ مدبر بھی ہیں۔ صلحنامہ لوزان کے متعلق خود لارڈ کرزن کا بیان سنیئے کہ وہ کیونکر انجام کو پہونچا۔ کیا اب جبکہ انگریز ترکوں سے تھریس اور ترکوں کے اصلی وطن ایشیائے کوچک چھین لینے کا کام یونانیوں کی سپرد کرچکے تھے، اور جو ایک موقع پر واقعتہً یہ تجویزیں کر رہے تھے کہ قسطنطنیہ یونانیوں کو دے دیا جائے اور جو نوآبادیات سے فاتح ترکوں کے خلاف اپنی طرف سے لڑنے کی درخواست کرکے مایوس ہوچکے تھے اور جبکہ ہندوستان سے یہ اُمید نہ تھی کہ مقدمہ کراچی کے بعد اب وہ اپنے فرزندوں کو توپوں کا چارہ بننے کے لئے بھیجے گا۔ تو کیا ان تمام باتوں کے بعد بھی انگلستان نے ہاتھ روک لیا اپنی حرکات پر نادم ہوا۔ حالات کے اُس فرق کو جو دوسرے عہدناموں (مثلاً عہدنامہ سیورے زبردستی منوایا گیا) اور اس صلحنامہ لوزان میں نظر آتا ہے خود لارڈ کرزن نے بھی امپیریل کانفرنس کے موقع پر اپنی تقریر میں ظاہر کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

لڑائی کے بعد جس قدر صلحنامے ہوئے ہیں اُن سب میں شرائط صلح کو بزور شمشیر تسلیم کرایا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک فاتح حکومت نے مرتب کیا اور وہ بھی اس طرح کہ گویا مجرم کی عدم موجودگی میں مسند عدالت پر بیٹھے ہیں اور جو سزا یا حکم نافذ کرنا چاہتے ہیں کر دیتے ہیں۔ اور جب شرائط تحریر پا جاتے تھے تب شکست خوردہ دشمن کو شریک کیا جاتا تھا اور وہ بھی صرف اس لیئے کہ اُس کو حکم سُنا دیا جائے اور وہ اس پر محض رسمی ناراضگی کا اظہار کرے۔ فی الحقیقت یہ ہی حالات تھی جبکہ ابتدائی عہدنامہ سیورے تحریر پایا تھا اور اُس پر دستخط لیئے گئے تھے اگرچہ ترکی نمایندوں نے اُسکی تصدیق کبھی بھی نہیں کی۔ لیکن لوزان میں حالت بالکل ہی مختلف تھی۔ وہاں ترک مجلس صلح میں دوسری سلطنتوں کے ساتھ بالکل مساویانہ حیثیت سے شریک ہوئے۔ عہدنامہ کی ہر ہر شرط پر اُن کے سامنے بحث ہوتی تھی اور اُن کو سمجھانا پڑتا تھا۔ اور اتفاق رائے بحث و مباحثہ سمجھانے بجھانے اور باہمی رضامندی سے حاصل ہوا کہ ڈرانے دھمکانے سے۔

ایک ہندوستانی اخبار نے جس پر ترکوں سے بہت زیادہ محبت رکھنے کا الزام لگایا جاسکتا لارڈ کرزن کی تقریر پر جس میں اُنھوں نے حمایت صلحنامہ لوزان اور اتحادیوں کی تدبر کی تعریف کی ہے اور یہ کہ اتحادی تدبر کا منشا یہ نہ تھا کہ وہ کانفرنس کو خاص معاملات کی وجہ سے جن کا شمار اصل مسائل میں نہیں ختم کر کے پھر جنگ شروع کریں یہ لکھا ہے:۔

صلح و نرمی اور معقولیت کا طرز عمل اگر جنگ پر آمادہ نہ ہونے کے سبب سے ہو تو اسکی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ جیسا کہ لارڈ ن نے کہا تھا کہ "ترک اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریزوں میں اب لڑنے کی ہمت نہیں ہے بلکہ بخلاف اس کے انتہا پسند نوجوان ترکوں کی جنگجو طبیعت سے بہت خائف تھے۔ اتحادیوں کو اس بات کا کبھی اطمینان نہیں ہوا کہ با اثر ترکوں کی مخلصانہ خواہش امن کب تک ان شورش پسند قوم پرستوں اور انتہا پسند طبقہ کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوگی"۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ ترکوں نے جو کچھ

چاہا اپنی تلوار کے زور سے حاصل کر لیا اور فاتح و مفتوح کا مرتبہ لوزان کے مقام پر بالکل برعکس ہو گیا۔ اس موقع پر ترکوں ہی نے اپنے شرائط تسلیم کرائے اور اتحادی جنھوں نے بعد جنگ دوسرے عہدناموں کے شرائط اوروں سے تسلیم کرائے تھے، ترکوں کے ان شرائط کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ لوزان میں "ڈرانا دھمکانا" ترکوں کی طرف سے ہوا، اور "رسمی ناراضی کا اظہار" اس موقع پر اتحادیوں کو کرنا پڑا۔

اس صلحنامہ کے متعلق بعض اُن معترضین کے جواب میں جن کی نسبت لارڈ کرزن کا خیال ہے کہ اُن کے اعتراض کی غرض ایسی ہے جس کو شبہ کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے، یہ ارشاد فرمایا کہ "اُن حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے لئے اس سے بہتر صلحنامہ کوئی نہیں ہو سکتا۔"

اس طرح یہ ایک اور مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترکوں نے جو کچھ چاہا لوزان میں حاصل کر لیا لیکن یہ اس وجہ سے نہیں کہ انگلستان کو ترکوں کے ساتھ انصاف کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو یا اُس نے مسئلہ خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی فرض و جذبات کا لحاظ کیا ہو بلکہ یہ سب کچھ انہیں خود انگلستان کی ترکوں کے ساتھ کھلی مخالفت اور احکام اسلامی کے ساتھ صریح بے پرواہی کے ہوتے ہوئے مل گیا۔ لارڈ کرزن تو ایک مرتبہ پھر ڈرانے دھمکانے پر عمل کرتے مگر افسوس تو یہ ہے کہ اب یہ قوت دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔

میں ارادۃً صرف ایک ایسے مسئلہ سے بحث کرتا رہا ہوں جس کا تعلق خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں سے ہے اور جس سے ہماری اس ہمدردی پر بھی اثر پڑتا ہے جو ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک سے وابستہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ معاہدہ لوزان سے ہمارے قومی معاملات اور ان مقتضیات کا جو ہمارے درمیان مشترک ہیں پورا ہونا تو کجا اس سے جزیرۃ العرب جیسا خالص اسلامی مسئلہ بھی طے نہیں ہوا۔

رہے ہمارے مشترک قومی معاملات سو وہ تعداد میں ان معاملات کہیں زیادہ ہیں جن کا تعلق صرف ہماری جماعت سے ہی۔ معاہدہ لوزان سے اگر کوئی نتیجہ مرتب ہوا ہی تو صرف یہ کہ ترکوں نے اپنے سوراج کو کیوں نہیں دیا جیسا کہ ایک صدی پیشتر ہماری حالت تھی۔ مجلس خلافت کے مطالبات اور جزیرۃ العرب کے متعلق ہماری مذہبی ذمہ داریوں کا پورا ہونا ابھی باقی ہی لیکن بالفرض ہم اس میں کامیاب بھی ہو جائیں تو کیا ہم مسلمان حکومت سے موالات کا ترک کرنا چھوڑ دیں گے اور اپنے ہم قوموں سے ترک موالات اختیار کر لیں گے؟ یہ تو اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ بڑی بداخلاقی ہوگی جن کی امداد سے ہم اب تک فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں اس کے ساتھ ہی مسلمانان ہندوستان یہ بھی ثابت کر دیں گے کہ جبکہ وہ ترکوں اور عربوں کے سوراج کے لیے اتنے مضطرب تھے انہیں اپنے سوراج کی مطلق پرواہ نہ تھی' اس وقت یہ کہنا بالکل سچا ہوگا۔

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

ترکِ موالات کا خطرناک بدل

نضرات امیں نے غالباً ایک دفعہ پھر آپ کو دیر تک منتظر رکھا ہی لیکن معاف فرمایئے
ان مسلمان دوستوں کو جنھیں آج اپنے رویہ کو بدل دینے کا سبق دیا جا رہا ہی
شتہ تلخ تجربوں کی بنا پر حکومت سے ترک موالات اختیار کرنے پر مجبور ہوتے
نہ یہ محسوس کرانا چاہتا ہوں کہ وہ کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ان معاملات
ندازہ کرلیں جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہی کہ جب تک
ستان دوسری نوآبادیوں کی طرح انگلستان کے ساتھ مساویانہ حقوق حاصل
تیا بلکہ چھ ہزار میل دور سلطنت برطانیہ کی غلامی کا دم بھرتا ہی ہم کسی طرح سے
ست ہندوستان کی نیک نیتی کے قائل نہیں ہوسکتے۔ مزید برآں ایک
ت کے ساتھ وفاداری کے علاوہ ہیں اور بھی بہت سی وفاداریاں درپیش
ب تک کہ مسلمانان ہندوستان کو جیسا کہ خود کراچی میں ہمارے ساتھ
یا گیا محض اس لیے سزا ملتی رہے گی کہ انھوں نے حکومت کی بجائے خدا کی
ی اختیار کی تھی اور جب تک کہ ارض مقدس جس کی حکم برداری خود خدا نے
ی نبی کی وساطت سے اُن کی آخری وصیت میں ہمیں عطا فرمائی ہی غیر ملکی
ول کے ہاتوں میں ہی اس وقت تک پرامن ترک موالات کے علاوہ جنگ
رناک چیز کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہی۔ لیکن چونکہ ان لوگوں میں سے
جو حکومت کے خوف سے غلاموں کی طرح ڈرتے ہیں اور خود کسی قربانی
تیار نہیں اس راہ کو اختیار نہیں کیا لہذا میری رسالے میں اس کا تذکرہ بھی
ہوگا۔

~~۲۳۳۱~~

غیر مسلموں سے مسلمانوں کا موالات

اگر ہم سلطنت برطانیہ سے ترکِ موالات کرتے ہیں تو کیا یہ بھی مناسب ہے کہ ہم اپنے
غیر مسلم بھائیوں سے بھی کم از کم موالات چھوڑ دیں۔ اس دن کے بعد سے جبکہ وہ پکا ہندو
یعنی مہاتما گاندھی مسلمانوں کی حمایت میں جیل گیا تھا آج کیا تبدیلی ہو گئی کہ ہم اُس کے
ہم مذہبوں سے ترکِ تعلق پر آمادہ ہو جائیں؟ مجھے معلوم ہے کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات آج
وہ نہیں ہیں جو آج سے دو برس قبل تھے۔ لیکن کیا کوئی ایماندار اور وطن دوست ہندوستانی
یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک قوم تو بالکل بے قصور ہے اور سارا جرم صرف ایک ہی قوم کا ہے؟ دوستو!
میں "حکمت عملی" پر اعتماد نہیں کرتا ہوں اور بالخصوص خفیہ حکمت عملی کا تو مطلق قائل نہیں۔
میں سر راجرڈی کاورے بن کر آپ کو اس اُصول سے زیر کرنا نہیں چاہتا کہ "اس مسئلہ کے
دونوں پہلوؤں پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے"۔ مالابار، ملتان، آگرہ، سہارنپور اور دوسرے
مقامات میں نہایت افسوسناک واقعات پیش آئے ہیں اور میں اس تجویز کی تائید کے لیے تیار ہوں کہ ایک
قومی عدالت قائم کی جائے اور وہ دونوں قوموں کے جرم کا اندازہ لگائے۔ اس لیے کہ اس سے
تو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم بھی جس کو سب سے زیادہ تکالیف برداشت کرنا پڑیں کچھ نہ کچھ شکایات
دوسری قوم کے لوگوں کی ضرور رکھتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اُس سے نہ کوئی مفید نتیجہ نکل سکتا ہے
اور نہ انصاف یہ چاہتا ہے کہ کسی ایک قوم کے سر سارا گناہ ڈال دیا جائے درانحالیکہ کافی تحقیقات
بھی نہ ہوئی ہو۔ میں نے دہلی میں بھی حقیقی معنوں میں نیابتی کمیٹی تحقیقات کے قائم کیے جانے کی
تجویز سے پہلو تہی نہیں کی۔ لیکن بعض وجوہ سے جن کے اظہار کی یہاں ضرورت نہیں اس کمیٹی کے
تقرر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو باتیں بہرحال ثابت ہیں۔ گورنمنٹ کی عدالتیں تو اس اثنا رہیں
کہ آپ اپنی اپنی قوم کے قصور کا اندازہ کرکے الزام اُن پر لگائیں یا ان کا کام تیدہ نہیں رکھیں گی۔

یقینی علاج

پھر کیا کیا جائے؟ میں نے ابھی کہا ہے کہ کسی ایک فریق کے بیان کو تسلیم کر لینا نہ صحیح ہے اور نہ اس سے وہ فریق جس کے بیان کو بغیر صحیح تحقیقات باور نہیں کیا گیا اصلاح تصفیہ سمجھوتہ نہ اس پر آمادہ ہو سکتا ہے جس تدبیر کو فوراً کام میں لانے کا مشورہ دے سکتا ہوں وہی سب سے بڑی تدبیر ہے اور اس کو دہلی میں اُس کمیٹی نے جو اُس مسئلے کے متعلق مقرر کی گئی تھی تقریباً منظور ہی کر لیا تھا۔ یعنی جب ہم یہ طے کر چکے تھے کہ ایک کمیٹی تحقیقات اُن مقامات پر دورہ کرے جہاں یہ افسوسناک واقعات پیش آئے تھے اور جو ہندو مسلم اختلافات کے بعد رونما ہوئے اور اس کمیٹی کے ممبران کو نامزد بھی کر چکے تھے اس وقت بھی یہ محسوس کر کے کہ فریقین کے لیڈروں کے طرز عمل میں ایک خوشگوار تبدیلی ہو رہی ہے ہم یہ ساری کارروائی کالعدم کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ گذشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط پر عمل کرنے پر دونوں آمادہ معلوم ہوتے تھے اور حصول سوراج کے لئے آج سے دو برس قبل جس اتحاد عمل سے کام لیا تھا اُسی پر پھر تُلے نظر آتے تھے۔ کھلی ہوئی بات تھی کہ اب دونوں فریق کے علمبرداروں کو ایک مرتبہ پھر اس اتحاد کی جھلک نظر آ گئی تھی جس کا بہترین نمونہ اور مبلغ دونوں مہاتما جی کی ذات تھی۔ اور اپنے اپنے فریق کی کامیابیوں کا تصور ایک مرتبہ پھر ان کو حقیر و قابل نفرت دکھائی دینے لگا تھا۔ لیکن ایک ذرا سی بات پر کچھ جھگڑا ہوا۔ اور وہ پھر الگ الگ ہو گئے۔ دوستو میری دعا ہے کہ خدا اُن کو اپنی اتفاق و اتحاد کی ایک جھلک پھر نصیب کرے۔ اور اس مرتبہ وہ ایک عارضی چیز نہ ثابت ہو جیسا کہ پہلے ہوا۔ بلکہ میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اتحاد کی وہ تصویر اور آزادی کا وہ منظر اپنے پیش نظر رکھیں جو صرف اتحاد قومی ہی کی فضا میں رکھ سکتے ہیں تاکہ اُس کے علاوہ ہر وہ چیز جو گو دیکھنے میں خوشنما معلوم ہو مگر جس میں غلامی سے کوئی بھی نسبت پائی جاتی ہو اُن کے لئے مطلق دلکش نہ رہے بلکہ

ان کے دلوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محو ہو جائے۔

اسباب اختلاف کی رکاکت

یقین کیجئے کہ میں ان اہم مسائل کو محض شاندار و خوشنما الفاظ سے طے نہیں کرنا چاہتا ہوں لیکن چونکہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ نہایت اہم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قابل تصفیہ مسائل میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن جو اسباب اس اتحاد کو مٹانیکے باعث ہوتے ہیں وہ نفرت انگیز حد تک رکیک ہیں۔ مجھے کسی بات سے اسقدر شرم نہیں آتی جتنی اُن اسباب کی رکاکت سے اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے لئے یہ دشوار ہوجاتا ہے کہ میں اپنے دشمنوں کے اس الزام کا جواب دےسکوں کہ ہم حکومت خود اختیاری کے ناقابل ہیں۔ جب میں غور کرتا ہوں کہ یہ اسباب جسقدر شرر انگیز ہیں اُسی قدر رکیک بھی واقع ہوئے ہیں حاشا و کلا میں ہرگز کسی انسان کے طریقہ عبادت پر طنز نہیں کرتا لیکن میری انتہائی مایوسی کو کچھ نہ پوچھئے جب میں خیال کرتا ہوں کہ میرے ہی ہموطن اور خود میرے ہم مذہب بھی ایسے موجود ہیں جو ہماری کھوئی ہوئی آزادی کی واپسی کو بلکہ مذہبی آزادی تک کو خطرہ میں ڈالنے پر صرف اس لئے باک نہیں رکھتے کہ اُن کے نزدیک پیپل کے درخت کی اُن شاخوں کو جو سڑک تک جھک آئی ہوں اور کسی لمبے سے ڈول ہالش کے نکلنے میں مزاحم ہوں کاٹ ڈالنا یا عبادت گاہوں کے سامنے اوقات عبادت میں ڈھول یا باجہ بجانا اور جلوس کو روکنا زیادہ مقدم ہے۔ حضرات! اگر ہم اپنا نفع و نقصان اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تو دوسروں کے ساتھ نہیں تو کم از کم اپنے ساتھ تو دیانت و صفائی برتیں اور آزادی کے خیال ہی پر فاتحہ خیر پڑھ دیں اور آزادی کا ل تو الگ رہی سوراج زیر سایہ برطانیہ تک کا نام زبان پر نہ لائیں۔ ہم غلاموں کو کیا سے یا کیا کو ہم سے واسطہ؟ جب شاہی اصطبل تک میں ہمارا گزر ہو نہیں سکتا تو قصر سلطانی میں توقع باریابی کے کوئی معنی؟

اور ہم کو کیا علاقہ اگر اسلام کی ارض مقدس میں کتنے ہی سرود خانے اور میخانے کھل جائیں یا مسلمانوں کی مقدس ترین امانت کا نیا پاسبان بھی کمزور افراد کے طویل رشتہ میں منسلک ہو جائے جس کا سرا ایک ایسی امپریل گورنمنٹ کی مٹھی میں ہو جو اُن کو انکی آبائی سلطنتوں سے فوراً نکال باہر کردے اگر اُن میں ذرا بھی خود داری کا احساس پیدا ہو جائے یا وہ یہ خیال کرنے لگیں کہ خدا نے اُن کو انسان بنایا ہے نہ کہ شہنشاہی نمائشگاہ کا ایک کھلونا

اگر ہمارا منتہائے نظر صرف علم اور پیپل کے درخت اور پر شور جلوس ہی ہیں تو ہماری ساری کانگریس و خلافت کمیٹیاں محض مسخرہ ہیں بس "پردہ گرادیں کہ تماشہ میں مزہ خاک نہیں" ہم کو واقعی اس بچوں کے کھیل کو ختم کر دینا چاہیے اور پہلی گاڑی سے گھر کا راستہ لینا چاہیے اور آج سے ہم کو ہمہ تن خود پروری میں لگ جانا چاہیے۔ یہی ایک مشغلہ ایک غلام قوم کے شایان شان ہے۔ کم از کم آزادی کا مقدس نام تو ہمیں بیکار زبان سے نکالنا ہی نہ چاہیئے بلکہ اپنے مخالفوں کے دعویٰ کے ساتھ اپنا اقبال بھی شامل حال کر دینا چاہیے اور تسلیم کر لینا چاہیے کہ گو مشرق کے تمام مذہبی پیشواؤں نے جو دنیا کے سارے مذاہب کا سرچشمہ رہے ہیں خدا کو منصف بتایا ہے لیکن وہ (نعوذ باللہ) اتنا بے انصاف ہے کہ نسل انسانی کے پانچویں حصے میں اُس نے حکومت خود اختیاری کی بالکل صلاحیت ہی نہیں رکھی ہے اور یہ صرف اپنی یورپ والی سفید رنگ مخلوق کو ہی حق دیا ہے کہ وہ اس (خدا) کی غلطی کی اصلاح کریں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں۔

لیکن اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو بھی اپنی طرح ذلیل کریں اور ایک عادل و منصف خدا کی شان میں کلمات کفر زبان سے نکالیں تو ہم کو اپنے ہیں اپنے مقاصد عالیہ کی رفعت تک بلند کرنا چاہیے اور عوام کو بھی ابھارنا چاہیے نہ یہ کہ خود ان کی پست سطح تک اتر آئیں۔

فساد کی جڑ

میری زبان پر ابھی عوام کی نسبت سطحی کا لفظ آیا ہے اس لئے میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ۱۹۰۴ء میں میں نے یہاں کی یونیورسٹیوں کی تعلیم پر جو تنقید کی تھی، وہ اب تک صادق آتی ہے اور آج تک "تعصب کی آگ جاہل اور اَن پڑھ لوگوں کے دلوں میں نہیں بلکہ ان لوگوں کے سینوں میں ہیجان و تلاطم پیدا کئے ہوئے ہے۔ جو "پڑھے لکھے ہوئے ہیں" یہ مذہب کی محبت ہرگز نہیں ہے جو ہمیں اپنے مختلف المذہب ہموطنوں سے سرگرم آویزش کرا دیتی ہے بلکہ محض ہماری رکیک خودغرضی اور حب جاہ ہوتی ہے۔ مہاتما کے ورود کے معنی یہ تھے کہ "اقوام کی حکومتیں" فنا ہوں اور اُن کے بجائے "قوم" کی ایک متحدہ حکومت قائم ہو جس کا سب سے بڑا امتیاز و شرف اس کے خاص خادم کی ذات ہو لیکن اپنی اپنی قوموں کے یہ چھوٹے چھوٹے فرمانروا جنہیں اپنے تخت خالی کرنے پڑتے تھے، کسی طرح اس کو گوارا نہ کر سکے کہ متحدہ قوم کی خدمت اقوام کے سب سے بڑے خادم کی زیر سیادت کرتے رہیں اور اپنی دوبارہ تخت نشینی کی آرزو کرنے لگے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے خاص رفقائے کار آزاد رہے اس وقت تک انہیں ہمت نہ ہوئی کہ علم بغاوت بلند کر سکیں۔ ان کے لئے نہ کوئی جگہ تھی، نہ کوئی مصرف۔ صرف دو صورتیں ان کے سامنے تھیں۔ یا تو کھلم کھلا اغیار کی غلامی میں رہیں اور یا اتحاد قومی کے منافقانہ متبع بن کر۔ چنانچہ انہوں نے آخر الذکر شق اختیار کی۔ لیکن جب مہاتما جی زندان یرودا میں قید کر دئے گئے تو یہ لوگ پھر دعویدار بن کر نکل آئے۔ مگر اب چونکہ مہاتما جی کی جانشینی ان کے بس سے باہر تھی اس لئے انہوں نے مسلسل یہ طریقہ اختیار کیا۔ (گو صاف الفاظ میں اس کا اقبال نہیں کرتے کہ اپنی تحریکات کا مرکز ذمہ اور مختص القوم جذبات کو بنایا تاکہ آپس کی رقابتیں اور بدگمانیاں بھڑک سکیں، اتحاد ملکی

میں رخنہ پڑے اور اُن کے گمشدہ علاقہ جات ایک بار پھر ان کے تحت میں آجائیں۔ مہاتما گاندھی کے ورود سے پہلے بہت سے چشمہ بہ رہے تھے، بعض بڑے بعض چھوٹے اور ایک دوسرے کے مقابل۔ اور ان میں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں چل رہی تھیں۔ لیکن ان کے ورود کے بعد تقریباً سارے کے سارے چشمہ مل جل کر ایک بڑا موٹا دھارا بن گئے اور ان کی حیثیت اس عظیم الشان دریا کے شاخوں کی رہ گئی جو سمندر کی جانب رواں ہے۔ اس گنگا کے وسیع سطح آب پر ایک لق ودق جہاز چل رہا تھا جس پر شایق کار ملاح تھے اور جس کے کپتان خود مہاتما گاندھی تھے اور جس پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ان ادنیٰ لوگوں کے ادنیٰ خیالات اور حوصلے یہی چاہتے ہیں کہ بڑے جہاز کو چھوڑ کر ہم لوگ پھر انھیں چھوٹی کشتیوں میں اتر آئیں۔ لیکن چونکہ سمندر کی طرف دریا کی تیز روانی میں ان چھوٹی کشتیوں کی کافی حفاظت ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اب وہ لوگ اصل نظام فطرت ہی کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ اور کوشش کرتے ہیں کہ دریا کا پانی پھر الٹ کر اس کی پرانی شاخوں میں بہنے لگے لیکن نظام فطرت کو الٹنا ممکن نہیں اور یہ کوشش ایسی ہے جس کی حماقت بڑے سے بڑے احمق دیہاتی پر بھی واضح ہے۔ آج میں ایسی کانگریس کی طرف سے ہندوستانی قوم کی طرف سے، اور اُس تقدیر الٰہی کی طرف جو ہم سب پر کارفرما ہے۔ اُن مٹھی بھر آدمیوں کو خبر کرنا چاہتا ہوں کہ انشاءاللہ وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے، اور ہندوستانی قوم ان کی عیارانہ کارروائیوں کے ساتھ کسی حالت میں رواداری نہیں برتنے کی۔

رواداری اور برادرانہ جذبۂ ایثار

دوستو! مجرم کو سزا دینا حدود سیاست میں بھی فائدہ سے خالی نہیں، لیکن سیاسی اختلافات دور کرنے کا سب سے بہتر علاج وہی ہے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں

کہ ایک دوسرے کی خطاؤں کو معاف کرنے اور بھول جانے کی صلاحیت پیدا کی جائے لیکن صرف اسی قدر کافی نہیں ہے بلکہ اگر ہم ناگوار واقعات کو بار بار رونما ہونے سے روکنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ جن اسباب سے یہ منافقات پیدا ہوتے ہیں انھیں مٹا دیں ہر زمانے کے مصلحین مذہب نے اس معاملہ میں مہلک کمزوری دکھائی ہے کہ انھوں نے مختلف سرچشموں سے کچھ اجزا نکال کر ایک مذہب کا معجون مرکب تیار کرانا چاہا۔

انھیں امید تھی

کہ تھیوسیفی کے اس طریقے سے وہ ایسے مذہب کی تجدید کر سکیں گے جس میں تمام مذاہب کے بہترین اصول ہوں گے اور ہر ملت کے افراد اس مذہب کو آسانی سے قبول کر لیں گے لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ خلاصۃ المذاہب سے امن و اتحاد میں کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ البتہ ان مصلحین نے اکثر اوقات ان کے مختلف مذاہب و ملل میں ایک اور اضافہ کر دیا جو پہلے سے موجود تھے اور اختلافات کو بڑھاتے جا رہے تھے۔ ایسی کوششوں کی ناکامیوں نے جن کا مقصد نیک تھا لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ رواداری کے طریقے اختیار کریں۔ لیکن یہ محض سہل انگاری، رواداری کیسا تھ عدم عقیدہ مندی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک سچا اصول ہے جو ان اعتقادات کے ساتھ ساتھ جن پر سختی سے قائم ہیں ہمیشہ سے موجود ہے میں اس کی توضیح یوں اتنے بہتر پیرایہ میں نہ کر سکتا جتنا ایک امریکن کے الفاظ درج کرنے سے جس نے ایک مرتبہ اپنے ایک ہموطن سے جس کے اعتقادات اس سے مختلف تھے، کہا تھا کہ میں تمہارے ہر ہر لفظ سے قطعاً اختلاف رکھتا ہوں لیکن جناب میں اپنا خون کا آخری قطرہ بھی اس لیے نذر کر دوں گا کہ آپ سے ان خیالات کے اظہار کا حق نہ چھین لیا جائے۔

دوستو! رواداری کی یہ بہترین تعریف ہے اور قرآن بھی جو اپنے کو یہ حکم دیتا ہے

کہ جب کبھی مذہبی آزادی پر حملہ ہو یا وہ خطرہ میں پڑ جائے تو اس کی خاطر جنگ تک سے دریغ نہ کرو (وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین للہ) رواداری کے متعلق اپنی تعلیمات کو ان مختصر الفاظ میں ادا کرتا ہے کہ "تمہارا دین تمہارے ساتھ اور میرا دین میرے ساتھ (لکم دینکم ولی دین)

اگر ہم سب اسی اصول پر عمل کرنے پر راضی ہو جائیں اور ساتھ ہی ساتھ روحانیت کی اعلیٰ شان جو تمام مذاہب میں شے مشترک ہے خصوصیت سے پیش نظر رکھیں تو دنیا میں جنگ و جدال کا خاتمہ اور ہر جگہ امن و سلامتی کا دور دورہ ہو جائے۔

اہم مسائل میں اس اصول پر عمل

اب میں ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان جو معاملات پیش آتے ہیں اس اصول کو منطبق کرنا چاہتا ہوں مثلاً یہ کہ اگر عام سڑکوں پر جلوس نکل سکتے ہیں۔ اور باجے پر کوئی اعتراض نہیں کرتا تو مسلمانوں کو ہندو یا کسی غیر مسلم کو باجے کے ساتھ جلوس نکالنے سے اُس وقت تک نہ روکنا چاہیے جب تک کہ ہمارے مذہبی فرائض کی بجا آوری مثلاً نماز یا دیگر عبادات میں کوئی خلل واقع نہ ہو یا مثلاً اگر ایک لمبا بانس یا علم اگر جلوس کے ساتھ کسی سڑک پر نکالا جائے جس سے کسی قسم کی خطرہ کا گمان نہ ہو تو کسی غیر مسلم کو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے اگر وہ دھوم سے باجے کے ساتھ نکالا جائے لیکن پھر بھی مسلمان جو ایسی ہی رسوم کے قائل ہیں جن میں کم از کم مذہبی نقطۂ نظر سے بہت کچھ شک و شبہ کی گنجائش ہے اُن کو کوئی حق نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم پڑوسی سے ایک درخت کی شاخ کاٹنے کا مطالبہ کریں جبکہ وہ درخت غیر مسلم کی زمین پر ہے اور اُس کی ملکیت کے علاوہ وہ اس درخت کو متبرک بھی سمجھتا ہے خواہ اُس کا یہ عقیدہ سچائی پر مبنی ہو یا غلطی پر۔ اسی طرح عام مقامات پر سگریٹ پینے کے خلاف کوئی قانون نہیں ہے تو کسی پارسی کو کسی غیر پارسی کے سگریٹ پینے پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ اگر پبلک مقامات پر تمباکو نوشی قانوناً ممنوع نہیں ہے تو کسی

پارسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی غیر پارسی کے بازاروں اور کوچوں میں سگریٹ روشن کرنے پر اعتراض کرے اگرچہ اس کو آگ جیسی مقدس چیز کی اتنی سی اہانت بھی گوارا نہ ہو اسی طرح جانوروں کا مارنا بھی کوئی جرم نہیں ہے اور اگر کوئی شخص اپنی یا دوسروں کی خوراک کے لئے یا محض قربانی کے خیال سے کسی پرندؔ گائے یا سوّر یا کسی دوسرے جانور کی ایسے طریقے سے جان لیتا ہے جس سے اسے کوئی غیر معمولی ایذا نہ پہنچتی ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے کسی ہمسائے کو محض اس بنا پر کہ اس کے نزدیک زندگی ایسی مقدس چیز ہے جسے کسی حالت میں بھی نقصان پہنچانا جائز نہیں یا اس لئے کہ اس کی نظر میں ہی "ماتا" کی سی وقعت حاصل ہے یا کسی اور ایسے خیال سے مثلاً یہ کہ باعتبار نجاست وہ سوّر کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتا ہے یا یہ کہ ایسی مذہبا جانوروں کے طریقہ ذبح سے اختلاف ہے اس فعل پر اعتراض کرے۔ یہ امر مسلم ہے کہ تمام ایسی حالتوں میں غار بوجہ جانور ذبح کرنے یا کرانیوالے کی ملکیت ہے نکہ اس کے ہمسائے کی جس کی جائیداد پر اسکا قانوناً کسی طرح کا بیجا تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ ہندوستان میں ابھی ہم نے اپنے ایک آتنی رواداری پیدا نہیں کی ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص اپنے حقوق کو آزادی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے اور ہمیں اس سے تعرض نہ ہو بلکہ ستم یہ ہے ہم میں بعض اشخاص کہ اپنے حقوق کے آزادانہ استعمال کا حق مانگتے ہیں وہ صرف اپنی غرض ہے اور اپنے طریقے پر اسے استعمال کرتے ہیں کہ اسی سے دوسروں کی دلآزاری ہو چنانچہ تمام ایسے موقعوں پر جیسے کوئی مذہبی جلوس کسی مقام سے گذر رہا ہو غیر مذاہب والوں کا اسکی ہنسی اڑانا یا معبد کے نزدیک ڈھول یا ایسی آلات موسیقی کا استعمال جن سے بجائے کعبہ کے اکثر شور و غوغا برپا ہوتا ہے بالخصوص ان اوقات پر جبکہ اس سے عبادت یا کسی اور مذہبی رسم کی ادائیگی میں خلل پیدا ہوتا ہے یا مثلاً عام گذرگاہوں میں ایسے درختوں کا جنہیں ہندو متبرک خیال کرتے ہوں بلا وجہ کسی اشتعال انگیز طریقے سے کاٹ دینا سکھوں

اور پارسیوں کے سامنے سگریٹ کا دھواں چھوڑنا یا کسی کے ہمسائیگی میں یا اس کے
سامنے جانوروں کا بے رحمانہ قتل یا قربانی کی گایوں کو ہندوؤں کے محلوں میں سے بار بار
پھرا کر گذارنا یا۔ اس لئے ایسے مقامات پر ذبح کرنا جہاں ہندوؤں کو مجبوراً یہ منظر دیکھنا
پڑتا ہے اور اس قبیل کے واقعات روزانہ مشاہدے میں آتے ہیں، خاصکر ان موقعوں پر
جب ایسے موقعوں کے درمیان بغض و عناد پھیل رہا ہو۔ ان مواقع پر اسی قسم کے کسی معمولی
جوش انگیز حرکت سے اکثر درشت کلامی اور پھر اس سے گذر کر مارپیٹ کی نوبت آجاتی ہے تو
بالآخر ہلاکت نفوس پر ختم ہوتی ہے۔

اس صورت حال کا علاج

ان واقعات کے سدباب کا کوئی قطعی نسخہ نہیں پیش کیا جا سکتا اور نہ کسی قومی میثاق
کی رو سے انہیں یکسر ختم کیا جا سکتا ہے خواہ اس معاہدہ کی دفعات کو جزئیات تک کیوں نہ
پھیلایا جائے کہ دنیا کے لئے مضحکہ ہو جائے۔ میں صرف اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ
اس کا بہترین علاج صرف طبیعت کا وہ انداز ہے جس میں ہماری مختلف قومیں اپنے حقوق
کو استعمال کرتی ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کوئی کانفرنس یا متحدہ قومی جماعت مختلف فرقوں
کے رہنماؤں کی باہمی مفاہمت کی مدد سے نااتفاقی کے پیچیدہ اسباب کو دور
کر سکے اور ایسا ابھی قطعاً کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کانگریس کو خیال رکھنا
چاہئے کہ جہاں وہ اپنے عوام کی رہنمائی ان لیڈروں کے ذریعہ ہمت و استقامت کے
ساتھ اس جانب کرتی ہے وہاں اس کی احتیاط رکھے کہ کسی قوم سے ایسے حقوق سے
دستبردار ہونے کا مطالبہ نہ کرے جو بالکل اس کی قوت استطاعت سے باہر ہوں۔ یاد
رکھنا چاہئے کہ سوراج گو ہماری مستقل منزل مقصود ہے اور عنقریب ہمارے پیش نظر ہی ہے
چاہئے تاہم ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ اور جب تک وہ حاصل نہ ہو اس وقت تک وہ دراصل تو

استعمال میں نہیں لا سکتے جو سرکار کو حاصل ہیں اور اس وقت تک تو ہمارے ہاتھ میں محض افہام و تفہیم اور اپنے عملی نمونہ کی قوت ہے، اور بس۔ لیکن اگر ہماری اپنی ہی حکومت ہو تو وہ بھی کسی کثیر جماعت کو کسی حق کے چھوڑ دینے پر نہ اخلاقاً نہ قانوناً مجبور کر سکتی ہے تاوقتیکہ وہ اس کے معاوضہ میں دوسری سہولتیں نہ پیدا کر دے۔

گاؤکشی

مسئلہ گاؤکشی کی مثال ہمارے سامنے ہے میں جانتا ہوں کہ میرے ہندو بھائیوں کی نگاہ میں گائے کس قدر مقدس ہے۔ اور مجھ سے اور میرے بھائی سے بڑھکر اور کون واقف ہوگا کہ ہمارے سردار کو جو اس وقت ہم میں موجود نہیں ہے۔ گائے کے تحفظ کی کس قدر فکر تھی تحریک خلافت کی انھوں نے جس بے نفسی کے ساتھ سربراہی کی وہ ان کی جبلی فراخ دلی اور ایثار کی روشن مثال ہے۔ لیکن وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ وہ مسلمانوں کی گائے یعنی اُن کی خلافت کے تحفظ کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ اس احسانمند قوم کو جس نے اپنی کتاب مقدس میں یہ سبق پڑھا ہو کہ "احسان کا بدلہ احسان ہے" (ھل جزاء الاحسان الا الاحسان) اسی طرح سے ان کی گائے کے تحفظ کے لئے آمادہ کیا جا سکے۔ یہ مہاتما گاندھی کا مخصوص طرز ادا گائے سے اپنی پر زور محبت کے اظہار کا تھا۔ لیکن ان کے ایسی پر لطف طرز ادا یعنی خلافت کو ہماری گائے قرار دینے سے پیشتر ہی میں نے اور میرے بھائی نے قصد مصمم کر لیا تھا کہ ہم گاؤکشی سے محترز رہیں گے چنانچہ اس کے بعد سے ہمارے گھر میں گائے کا گوشت کبھی نہیں استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے ملازموں اور نوکروں نے بھی یہ احتیاط برتی۔ اور اب ہم اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اپنے ہم مذہب بھائیوں سے بھی اس قسم کے طرز عمل کی درخواست کریں۔ جہاں تک قربانی گاؤ کا تعلق ہے۔ اور یہ ایک مذہبی فرض ہے۔ میں نے اور میرے بھائی نے کبھی گائے کی قربانی نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ

بکرے کئے اس طرح سے بہت کچھ کرنا ممکن ہی کہ اور اُس وقت تک ہندو مسلم اتحاد کی وقت تھی۔ تین چار سال کے تجربات نے ہمیں یہ بتا دیا ہے کہ سوراج حاصل کرنے سے قبل بھی یہ بآسانی ممکن ہے کہ گائے کی قربانی اتنی کم ہو جائے کہ محض برائے نام باقی رہجائے۔ لیکن جہاں یہ میری دلی تمنا ہی کہ روزانہ گاؤکشی جو صرف غذا کے لئے سال بھر ہوتی رہتی ہے اسے بھی قطعاً بند ہو جانی چاہئے۔ یا کم از کم برائے نام درجہ پر آجانی چاہئے وہاں دوسرے طرف مجھے اس کا بھی پورا اندازہ ہی کہ اس تمنا کی عنقریب برآمد ہونے کی توقع رکھنا ایک سودائے خام ہی ہندوستان کے مسلمان جو بکری کا گوشت گراں قیمت پر خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں شاید ہی گائے کا گوشت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عوام الناس میں غریب مسلمانوں کے لئے یہ ایک عام غذا ہی نا ف روہیلکھنڈ یا "سرزمین روہیلا" کے باشندہ ہونیکی حیثیت سے میں خوب جانتا ہوں کہ موجودہ حالات میں اُن کے لئے گائے کا گوشت چھوڑنا کسقدر دشوار ہے۔ ایک پٹھان جب ہندوستانیوں سے جو "اناج کو اناج کے ساتھ ملا کر کھاتے ہیں" ملتا ہی تو اظہار حیرت باز ہی نہیں رہ سکتا اور رام پور کے لگی باز تو کہا کرتے ہیں کہ "گوشت ہونا چاہیے گتے ہی کا ہو" جب رامپور نے ہندوستان کی دیگر میونسپلٹیوں کے تقلید میں گوشت کی متعدد دوکانوں کو بند کرکے اس کی بجائے ایک بڑا "گوشت بازار" بنوایا تھا تو اُس وقت گوشت کی مانگ اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اُس کا پورا کرنا محال ہو گیا تھا۔ اور محدود مال پر گاہکوں کے ٹوٹ پڑنے کے جیسے تلخ اور مضر نتائج ظہور میں آئے انکی بنا پر بالاخر "مارکیٹ" کا نام بدلکر "مارپیٹ" کہنے کی ضرورت پیش آگئی مسلمانوں کے اس طبقہ کے لئے گائے کے گوشت کے استعمال نے اس وقت ایک اقتصادی ضرورت کی صورت اختیار کرلی ہے پس ایسی حالت میں گائے کشی کے روکنے کی اگر کوئی ٹھیک اور کارگر صورت ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ بکری کے گوشت کی قیمت کم ہو جائے جو اس وقت حد سے زیادہ ہوگئی

ہے۔ اور اس طرح سے جو گائے اور بکری کے گوشت کی قیمت میں جو عظیم تفاوت ہے
وہ بہت گھٹ جائے۔ میں اس بات کا ہرگز ہرگز خواہشمند نہیں ہوں کہ اس وقت اس
غریب ملک کے کسی طبقے کے مصارف زندگی بڑھا دیں جو جائے کہ خود میری قوم جو سب سے
زیادہ غریب ہے۔ لیکن میں اس قدر تو بہر حال عرض کروں گا کہ گائے کے مالک سب سے
زیادہ تعداد میں ہندو ہی ہوتے ہیں اور اگر وہ جبکہ ان کی گائیں دودھ دینا بند کر دیتی ہیں
فروخت نہ کریں تو گاؤکشی میں بہ نسبت آج کے نمایاں کمی واقع ہو جائے گی آج بھی ہم بھیڑوں
اور بکریوں کی پرورش کو رواج دے سکتے ہیں۔ تاکہ گائے محفوظ رہ سکیں۔

سوراجیہ حکومت کے لئے میزانیہ (بجٹ)

اس میں زیادہ دشواری نہ ہو گی کہ فوجی اخراجات کم کر کے اس کے بجٹ کو
دوسرے کاموں میں لگایا جائے۔ لیکن آج بھی میں اپنے ہم مذہبوں سے درخواست
کرتا ہوں کہ وہ گائے کے گوشت کا استعمال ترک کر دیں اور اس کا انتظار نہ کریں کہ
سوراج حاصل ہونے پر ایسا کریں گے تو اس وقت ان کا ایثار اس قدر قابل قدر نہ ہو گا
ہندوستان کی مختلف قوموں کا معاشرتی و سیاسی نصب العین ہمارے مشترکہ مفاد
کا اصول ہونا چاہیئے نہ کہ باہمی [illegible] کا آزاد مقابلہ لیکن۔ اگر کبھی ان جماعتوں
میں جو ہندوستانی مشترکہ خاندان بناتی ہیں مقابلہ بھی ہو تو یہ مقابلہ
ذاتی ایثار و تحمل پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جو جماعت برضا و رغبت
اپنے نہایت ہی گراں قدر حقوق اور دلی جذبات محض ایک اعلیٰ جماعت اور
ہندوستان کے امن و امان کے لئے قربان کر دیتی ہے وہ حقیقتاً بعد میں نہایت
ہی زبردست اور ناقابل تسخیر ثابت ہو گی۔

نمایندہ جماعتوں اور حکومت میں فرقہ وارنیابت

میں ابھی آپ کے سامنے ظاہر کر چکا ہوں کہ فرقہ وارانہ جھگڑے کی نسبت تعلیم یافتہ طبقے نے اپنی ذاتی اغراض کی بناء پر عام لوگوں کو گمراہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس کے متعلق میرا کیا خیال ہے لیکن صرف ذبیحہ گاؤ اور جلوس باجے ہی وہ اسباب نہیں ہیں جو ذریعہ اشتعال ہوتے ہیں۔ بلکہ نمایندہ مجالس میں جداگانہ نیابت اور لوکل پراونشل اور امپیریل نظام حکومت میں فرقہ دار حقوق کی وجہ سے بھی سخت فرقہ وارانہ اختلافات ظہور میں آتے ہیں اور یہ قطعی ناممکن ہے کہ اس کا بھی الزام بغیر تعلیم یافتہ ہی فرقوں کے سر رکھا جائے۔ یہاں بھی ذاتی اغراض خواہ ان پر کیسا ہی پردہ ڈالا جائے یا ہلکا نا فرقہ وارانہ جھگڑوں میں بڑا کام کرتے ہیں ایسے پر زور فقرے جیسے اعلیٰ قابلیت اور افضل تعلیمی استعداد اس لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ جس بے انصافی کا مطالبہ کیا جاتا ہے وہ ظاہر نہ ہو، مگر اور بھی زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ جب غیر ملکی اقتدار کے علمبردار بالکل اسی طرح چلے پیش کرتے ہیں، یہی لوگ کمال بے دردی سے انھیں بے نقاب کرتے ہیں۔ چونکہ اجارہ داروں کی اس اعلیٰ استعداد کے مغالطہ کا کلیۃً سدباب نہیں ہوا لہذا میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ چند افراد کی فراست کثیر افراد کے مفاد کی کافی حفاظت نہیں کر سکتی اور ایسی صورت میں کہ لوگ وسیع النظر حب الوطنی کے خیال سے بے بہرہ ہوں تو ایک طبقہ یا جماعت کی اعلیٰ دانشمندی دوسرے فرقوں یا جماعتوں کی نگاہ میں ایک خطرناک چیز سے زیادہ وقعت نہیں رکھ سکتی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جہاں اغراض پر سے نہ ہوں تب بھی وہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھی جائیں حضرات ہمارے کرم (Karma) ہیں جو یہ گذشتہ نسلوں کی بے انصافی کا ورثہ ہے ہمارے لئے بجائے بے چارا شکی کے یہ زیادہ بہتر ہے کہ ہمارے

اعمال نیک اس قدیم شہرت کو مٹا کر دیں سیاست میں بھی تجارت کی طرح سب سے پہلے
اعتماد قایم ہونا چاہیئے ایک عمدہ بھی کھانا اور خاصہ معتدل منافع کاروبار کے استحکام
میں محض ایک دلکش مستقبل کی نسبت بدرجہا بہتر ہے۔ اگر قلیل التعداد طبع اس جماعت
پر کافی اعتماد رکھتے جن کے ساتھ شرکت کے لئے ان کو دعوت دی گئی تھی تو ہم آزادی
اور خود مختاری کی شاہراہ پر بہت آگے بڑھ گئے ہوتے لیکن کانگریس کے متفقہ
پلیٹ فارم نے ہمارے لئے نہایت ہی اچھا موقع بہم پہنچا دیا ہے کہ ہم اپنے اغراض کے
متعلق یہ ثابت کر دیں کہ وہ سراسر وطن کے محبت پر مبنی ہیں اور چاہے اس میں کتنا ہی وقت
صرف ہو ہمکو اپنا اعتماد قایم کرنا ہے اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور نا واجب شبہات
پر برافروختہ ہو جانا یا جو لوگ ایسے شبہات رکھتے ہوں اُنکو دبانا اور اُن سے توقع
کرنا کہ وہ ہمپر اعتماد کریں حالانکہ وہ نہیں کرتے تو یہ نہایت ہی مذموم طرز عمل ہوگا
معاہدہ لکھنؤ جس نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ ایسے معمولی اصلاحات دے ہم
ہیں سے اُن لوگوں کے لئے جو مجالس واضع قوانین میں جانا چاہتے ہیں۔ راضی
کر لیں چنانچہ ایسا ہوا لیکن ہمارے لئے یہ اصلاحات تازیانہ ہونا چاہئیں۔
تاکہ ہم اپنے قومی مقصد سوراج کو جلد حاصل کر کے اصلی نمائندہ مجالس میں فرقہ وار
نیابت کی صحیح تقسیم کر سکیں۔

دوستو! میں آپ سے صاف صاف کہوں گا کہ کچھ عرصہ تک ہمارے لئے جدا گانہ
انتخابات کے طریقہ کو چھوڑنا ناگزیر ہے۔ لیکن میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس
دن مجھے سب سے زیادہ مسرت ہوگی جبکہ قلیل التعداد جماعتیں اس بات کا خود اعلان
کر دیں گی کہ اُنھیں اب اس قسم کے تحفظ کی حاجت نہیں رہی۔ اس مسئلہ پر میرے
سچے خیالات اور طرز عمل کے سمجھنے میں شاید زیادہ مدد ملیگی اگر میں آپ سے بیان کروں کہ
ترکی کی مشرقی ولدیت میں جو آرمینیا کے نام سے مشہور رہی۔ قلیل التعداد عیسائیوں

کے تحفظ کے لیے میں نے اسی ہندوستانی طریقہ کو رائج کرانیکی سخت کوشش کی تھی۔ مگر ہمیں علیحدہ انتخابات کے اس اصول کو بالکل اوڑا دینے سے قبل دو درمیانی طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اول یہ کہ قلیل التعداد جماعتوں کو اس کی پوری آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس ہندوستانی کو چاہیں اپنا نمائندہ منتخب کر سکیں۔ اور میں تو اس کو سب سے بڑی عزت سمجھوں گا کہ جس دن کوئی غیر مسلم قلیل التعداد جماعت مجھے قومی مجلس میں اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کرے۔ اور مجھے تو کوئی مسلمان ایسا نظر نہیں آتا جسے میں اپنا ووٹ اس اعتماد کے ساتھ دیکوں جس اعتماد سے میں سب سے بڑے حامی خلافت مہاتما گاندھی کو دیسکتا ہوں۔ دوسرا طریقہ جو ہم بآسانی اختیار کر سکتے ہیں وہ یہ ہونا چاہیے کہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخابات بتدریج بنتے جائیں۔ آپ لوگوں میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ جب ہمارے منٹو اصلاحات زیر بحث تھیں تو میں نے رائٹ آنریبل سید امیر علی کی مخالفت کی تھی جو مسلمانوں کے لئے علیحدہ جگہ کے مقابلہ میں چاہے وہ کتنی ہی کم ہو مشترکہ حق انتخاب کے لئے ایک جگہ بھی چھوڑنی نہیں چاہتے تھے۔ جیسوں جیسوں فرقوں کے باہمی تعلقات خوشگوار ہوتے جائیں گے مشترکہ حلقہ انتخابات کی تعداد بھی برابر بڑھتی جائیگی اور جداگانہ انتخابات کی جگہیں کم ہوتی جائینگی۔ یہانتک کہ تمام انتخابات مشترکہ رقبہ وار حلقوں میں ہونے لگیں گے۔

یہی اصول ملازمتوں کی جگہوں کو فرقہ وار مقابلہ سے مشترکہ صورت میں لانے کے لیے بھی برتا جاسکتا ہے۔

تمام مندرجہ بالا صورتوں کو مقامی مجلسیں بناتے وقت ہی خیال رکھنا چاہیئے چونکہ گو اکثر واقعات تو زیادہ اہم نہیں ہوتے مگر لوگوں کے جذبات کا جو اس سے متعلق ہوتے ہیں زیادہ مشتعل ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

صوبہ پنجاب میں میونسپلٹی کے اندر نیابت کی غلط تقسیم پر بدقسمتی سے جو جھگڑے

ہو رہے ہیں۔ وہ اس امر کی کافی تصدیق کرتے ہیں اس صوبہ کے حالات پر بعض اوقات
مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کہ کیا جلیانوالہ باغ اور وہ گلیاں جن میں پیٹ کے بل لوگوں کو
رینگنا پڑا تھا۔ واقعۃً اس صوبہ پنجاب میں واقع ہیں۔

غلط علاج

میں نے اپنے اس خطبے کے آغاز میں اپنے ایک اور خطبہ کی چند سطروں کا حوالہ دیا
تھا۔ کہ جو ۱۹۲۰ء میں دیا گیا تھا۔ اور اس میں میں نے مخاطبت کو خبردار کیا تھا۔ کہ
جو اتحاد محض مخالفت پر مبنی ہو۔ اعتماد نہ رکھیں۔
میں آخری شخص ہونگا۔ جو یہ یقین کرے۔ کہ ہم لوگ صرف مارشل لا کے واقعات
یاد کر کے متحد رہ سکتے ہیں بہت سے اتحاد جب کوئی آفت آگئی تو اسکی مدافعت کے لیے
قائم کیے گئے۔ لیکن جونہی فتح اور کامیابی کی جھلک اور اپنی حکومت کے ابتدائی آثار
نظر آئے۔ تو یہ اتحاد بھی ختم ہو گئے۔ اس لئے اگر سوراج حاصل کرنا ہی نہیں۔ بلکہ اسے
کو قائم رکھنا بھی مقصود ہے۔ تو ہمارا اتحاد کسی دائمی حقیقت پر مبنی ہونا چاہیئے۔ بجائے
اس کے کہ ہم اپنی اپنی مظلومیت یاد کر کے متحد رہیں۔ اور میں ہندو مسلمان دونوں کو یاد
دلانا چاہتا ہوں جو ایک دوسرے کی زیادتیوں کا راگ اس بلند آہنگی سے گا رہے
ہیں۔ کہ میں دونوں کے لیے جلیانوالہ باغ میں گولیوں کی بوچھار بدمعاشوں کا
خود اپنا ایک گروہ ہوتا ہے جس کو کسی فرقے سے تعلق نہیں جس میں جو کوئی بھی شامل ہوجاتا
وہ آن ہی جیسا ہو جاتا ہے۔ لالہ راجپت رائے نے اپنے زمانہ جلا وطنی امریکہ میں ایک
مضمون شایع کرایا تھا جس کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ پنجاب کے بعض اضلاع
میں ہندو دولتمند طبقہ کو مسلمان بدمعاشوں کے زیادتی سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی
تھی۔ اسوقت دونوں قوموں کے باہمی نزاع کا سخت اندیشہ تھا لیکن لالہ جی نے فوراً

ہی بتا دیا کہ ہندو اپنے مذہب ہونے کے وجہ سے اس لئے مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئے
ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ دولتمند طبقہ کے لوگ ہیں۔ یہ روپیہ ہونے یا نہونے کا سوال تھا
ہندو اور مسلمان کا نہیں یہ بات ہمیشہ مدنظر رہنی چاہیئے بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب
صرف دو ہی لڑنے والے فریق نہوں بلکہ ایک تیسری صاحب بھی جو ہم پر اسی شد و مد سے
ہنستی ہیں جس شدت سے ہم لڑتے اور ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور نے
شمالی ہند کے فسادات کے بعد دو قوموں کے باہمی تنازعات کے متعلق بہت کچھ فرمایا
ہے۔ لیکن ان لکچروں کی جو روئیداد ہم تک پہنچی ہے اوس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید
اُن کو اپنی وہ تحریر بھی یاد نہیں جو اسی مسئلہ کے متعلق ایسے ہی فسادات کے موقع پر انہوں
نے لکھی تھیں۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ وہ فسادات بہت پہلے سے طیاری کے بعد
اور زیادہ شدت سے برپا کئے گئے تھے میرا اشارہ ہلا بہار میں ۱۹۱۶ء کے طرف ہے۔
اس زمانہ میں وہ سفر میں تھے اور اُن کے ہی گاڑی میں ایک انگریز فوجی افسر بھی موجود
تھا جو ہندوستانی مطالبات کی ہنسی اڑا رہا تھا۔ ڈاکٹر ٹیگور سے اونہیں نے دریافت
کیا کہ آپ کے ہم وطن سوراج کا نام کیونکر لے سکتے ہیں جبکہ حالت یہ ہے کہ مجھے باوجود
غیر ملکی ہونے کے طلب کیا جاتا ہے کہ اپنی سپاہیوں کے ذریعہ اُن مقامات میں امن قایم کر دوں
جہاں مختلف المذاہب ہندوستانیوں کے درمیان فسادات ہوئے ہیں۔ کم از کم اس
وقت تو ہماری شاعر کو بھی یاد آگیا کہ ایک تیسری صاحب بھی ہیں جو ہماری تکالیف پر
ہنستے ہیں اور اس انگریز افسر کو ان تیسرے صاحب کے وجود کو جتنا بھی دیا۔ تب اس
افسر نے پوچھا کہ کیا انگریزوں کے آنے سے قبل اس قسم کے جھگڑے نہیں ہوتے تھے
اس کے جواب میں ڈاکٹر ٹیگور نے فوراً تسلیم کیا کہ پہلے بھی جھگڑے ہوتے تھے لیکن اس
وقت اختلاف کی وجہ صرف ایک تھی۔ اس میں شک نہیں کہ لڑتے بھڑتے تو وہ اس
زمانے میں بھی تھے لیکن بہت دل تک اوڑھے اور اکڑے نہیں رہتے تھے اس لئے کہ

جہاں ان کا غصہ اترا اور انھیں یاد آیا کہ چار ناچار دونوں کو ایک ملک میں رہنا سہنا اور ایک ساتھ رہکر بسر کرے اور بغیر آپس میں پیار محبت رکھے زندگی اجیرن ہے تو وہ فوراً اپنے جھگڑے فیصل کر کے پھر دوست بن جاتے۔ لیکن جب سے یہ تیسرے صاحب تشریف لائے ہیں اس قسم کے جھگڑے تو بار بار ہونے لگے مگر فیصلے مشکل سے اور دیر میں ہوتے ہیں انگریز خاوند اور ہندوستانی جورو کے گھریلو زندگی مصیبت ہو جاتی ہے جب ایک تیسری ہستی بھی اس میں شریک ہو جائے جسے ساس کہتے ہیں لیکن اگر ساس گھر میں خالی رہتی ہی نہ ہو بلکہ سارا کام کاج بھی اسی کے ہاتھ میں ہو تب تو اس گھر کے صلح و سازگاری کا کہنا ہی کیا ہے! سب سے بدتر یہ کہ ساس صاحبہ اپنے طرز عمل سے میاں بیوی دونوں کو بچھڑ کے زندگی گزارنے کی خواہش پر مجبور کرتی ہیں کیونکہ وہ دونوں کے ماں بن کر جیسا موقع دیکھا کبھی اسے دباتی ہے کبھی اسے دھمکاتی ہیں۔ کبھی اس سے ہمدردی کرتی ہیں کبھی اس کی دلجوئی۔ اگر ہم میں ذراسی عقل اور سمجھ ہوتی کہ اس مکار کے جال میں نہ پھنسیں تو یقیناً ایسی ساس کے وجود پر ہمیں ہنسی ہی آتی چاہئے تھی۔ لیکن حالت یہ ہے کہ جس وقت کسی مسلمان نے ہندوؤں کو غصہ دلانے کے لئے گائے ذبح کی یا کسی ہندو نے نماز کے وقت مسجد کے سامنے سے باجے گاجے کے ساتھ جلوس نکالا تو ہم ایک دوسرے کا گلا دبوچنے کے لئے فوراً مستعد ہو جاتے ہیں اور یہ بات بالکل بھول جاتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ کو کسی مسلمان پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنے ہم مذہب کے خلاف ثبوت بہم پہنچانے کے لئے مسلمان تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی حال ہندوؤں کا ہے ہمارے اپنے مصائب نے ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ ہندو مسلمان دونوں قوموں میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جن سے گندے سے گندے جو کام چاہا جائے لیا جا سکتا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی یا اپنی ساری قوم کو مضرت پہنچانے کے لئے تیار ہوتا ہے مقام تعجب نہیں اگر اسی کام کو کرنے کے لئے کسی ہندو کو تیار کیا جائے۔ دوستو!

بدمعاشوں کے طرح غداروں کا بھی کسی قوم سے تعلق نہیں۔ آپ میں سے بعض نے سنا ہوگا کہ حزب العمال نے مالیات بین الاقوام کی سخت مذمت کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اس بین الاقوامی غنڈا پن، کی جو ہمارے درمیان پھیل رہا ہے اس سے بھی زیادہ مذمت کا حق حاصل ہے، بہت ممکن ہے کہ کوئی مسلمان رات کیوقت کسی مندر میں در پردہ گائے کا گوشت پھینکدے یا کوئی بت توڑ ڈالے لیکن من حیث القوم مسلمان اس اشتعال انگیزی سے قطعی بری الذمہ ہونگے، اسی طرح اگر کوئی ہندو مسجد میں سور کا گوشت پھینکدیتا ہے یا قرآن پاک کی توہین کرتا ہے تو پوری ہندو قوم اس کی ملزم نہیں ٹھرائی جا سکتی۔ لیکن ان ہندو یا مسلمان وزرا کا معاملہ تو اس سے زیادہ صاف ہے جو اپنی حب الوطنی کے جوش میں اپنی قوم کو ناجائز فائدہ پہنچانیکی کوشش کرتے ہوں اس لئے کہ اُن کا تعلق خواہ کسی مذہب سے ہو وہ بہر حال ایک بیرونی حکومت کے رکن ہیں۔ بایں ہمہ ایک ایسے صوبے کے باشندے جنکو ابھی تک کسی ڈارٹیا اوڈوائر کی پنشن بند کرانا باقی ہے محض اس لئے کہ ان کے صوبے کے ایک وزیر نے اصلاحات جیسی بیہودہ چیز سے فائدہ اٹھانے میں اُنکی حق تلفی کی ہے ان لوگوں کے ساتھ فسادات پر آمادہ ہوتے جاتے ہیں جنکو ابھی تک اصرار ہے کہ ہندوستانیوں کے قاتلوں کو اُنکی خدمات کا صلہ ہندوستانی ہی کے روپیہ سے دیا جائے۔ ان باتوں کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ترک موالات کا مطلب آخر کیا ہے، جہاں کانگریس تمام ایسے لوگوں کا علی الاعلان خیر مقدم کرنے کے لئے طیار رہے جو اپنی ملازمتوں سے علیحدہ ہو جائیں اگرچہ بالفعل اس کا اقدام کیسا ہی پیشتر از وقت کیوں نہ ہو وہاں ایسے لوگ موجود ہیں جو محض اس لئے کہ اُن کے صوبے کا ایک وزیر اپنے ہمقوموں کو چند معمولی ملازمتیں دلانے میں جانبداری سے کام لے رہا ہے تمام ان باتوں کا بھول جاتے ہیں جو انہوں نے ترک موالات کے متعلق ایک وقت مہاتما گاندھی سے سیکھی تھیں۔

دوستو! یہ امر میرے لئے کچھ کم ناگوار نہیں کہ اتفاق سے یہ وزیر میرے ہم مذہب ہیں
ہیں۔ آپ یقین کیجئے میں اس وقت اور بھی شرمندہ ہوتا اگر ایسی ایسی ادنیٰ ملازمتوں
کی شکایت مسلمانوں کی طرف سے کیجاتی۔ حکیم اجمل خان صاحب نے جنکی جلد از جلد پوری
صحت یابی کے لئے ہم سب دست بدعا ہیں، مجھ سے بیان کیا کہ ملتان میں بعض مسلمانوں
نے جب مجھے لیجا کر مسجد کی دیواروں پر کچھ نشانات اور گنبدوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے
دکھائے اور یہ کہا کہ اگر ان کے مندر توڑے گئے ہیں تو ہماری مسجدیں کب محفوظ رہیں
تو یہ سنکر بیحد شرم آئی۔

عقلمند اور بیوقوف ماں کی تمثیل

میں اس واقعہ کا ذکر ہرگز نہ کرتا اگر مجھے اس معاملہ میں ہندوؤں کے رویہ کی حمایت
کرنی منظور ہوتی۔ میں نے یہ اس لئے کیا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی دماغی کیفیت
بھی کچھ اس سے بہتر نہیں معلوم ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ دونوں جماعتوں میں سے کوئی بھی
ان چھوٹی باتوں کے خیال کرنے سے بالاتر نہیں ہے۔ لیکن اگر مسلمان کچھ بہتر ہوتے
تو میں اس صورت میں بھی ہندوؤں سے شکایت نکرتا کیونکہ تجربہ بتاتا ہے کہ اس سے
کوئی فائدہ نہیں کہ ایک جماعت کا شخص دوسری جماعت کے لوگوں کو تنبیہ کرے۔ یہ
کام خود اسی جماعت کے لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ کتنی بار ہم نے دیکھا ہوگا کہ ایک شہر
کے کسی محلہ میں چھوٹے چھوٹے بچے آپس میں کھیلتے ہیں اور اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر
جھگڑنے لگتے ہیں، ہر ایک بچہ اپنی ماں کے پاس جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کی شرارت
اور اپنی خوبیوں کا پُردرد قصہ بیان کرتا ہے۔ سمجھدار ماں اپنے ہی بچہ کو جھڑکتی ہے اور
اگر بچہ اب بھی مصر ہے تو وہ اس سے کہدیتی ہے کہ آئندہ سے ایسے شریر لڑکوں کے
ساتھ کھیلنے نہ جانا۔ وہ سڑک جہاں عموماً بچے کھیلتے ہیں، خارج از حدود کر دیجاتی ہے۔

لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں تنہائی گراں گزرنے لگتی ہے اور چند دن کی علیحدگی انھیں ان کے خطاؤں سے پاک صاف کردیتی ہی حتیٰ کہ دوسرے تیسرے دن وہ سب کے سب آزاد ہوجاتے ہیں اور اس بچہ کو بھی ان کے ساتھ کھیلنے کی ماں سے اجازت پھر ملجاتی ہی اگرچہ اس مرتبہ اس سے یہ تاکید کردیجاتی ہی کہ اب ہمسایوں کی بیجا حرکتوں کی شکایت نہ لانا۔ اور میل جول رکھنے کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہی۔ میں نے بہیری ناسمجھ اور سمجھدار دونو طرح کی ماؤں کو دیکھا ہے اور غالباً کثرت تعداد اول الذکر قسم کی ہوگی۔ جونہی بچے ہمدردی اور زیادہ تر امداد کے لئے اپنی ماں کے پاس آتے ہیں تو وہ تکلیف کے مارے ان کے سامنے رونا شروع کردیتی ہے اور جب اس سے تھک جاتی ہی تو دوسرا طریقہ یہ اختیار کرتی ہی کہ اس شریر بچے کی ماں کے پاس جس نے اس کے فرشتہ سیرت بچے کے ساتھ ناانصافی کی تھی جاکر نہایت ترشروئی کے ساتھ شکایت کرتی ہے اور دبی زبان سے یہ بھی کہتی جاتی ہے کہ بچہ کی تربیت خراب ہوئی ہے۔ معاملہ آگے بڑھتا ہی اور دوسری جانب سے شکایت لانیوالی کو شیطان کہا جاتا ہے اور ایسے والدین کے ساتھ بچہ کی پرورش ہونے میں غریب بچہ کا کیا قصور ہے اب اس کے بعد مزید سلسلہ شروع ہوتا ہی۔ گالیوں کا ایک طومار جنبدہ جاتا ہی یہاں تک اس کے ساتوں پشت کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اس کے بعد مردوں کی کمک پہنچتی ہی اور اگر وہ بھی ویسا ہی ناسمجھ اور اسے بھی عزت کا ویسا ہی خیال ہے تو وہ ایسی باتیں کہنے لگ جاتا ہے جس سے اس کے حریف کی عزت ہمیشہ کے لئے خاک میں ملجاتی ہے۔ اسی طرح جب یہ لفظی گولہ باری سنکر دوسری جانب سے مردوں کی کمک میدان میں آتی ہے تو وہ اس لفظی جنگ میں التوا کردیتا ہے اور عملی شخص کی طرح دوسرے آدمی کا سر توڑ دیتا ہے۔ اگر یہ جھگڑے کنبہ ہی تک محدود رہیں تو وہ ایک خوش نصیب محلہ ہے۔ سارے نزاع کی بہترین تفسیر اس امر سے ہوتی ہے جبکہ پولیس فریقین کے والدین کو حوالات کی طرف لیجاتی ہے تو وہ بچے ہاتھ میں ہاتھ دیے گلی ڈنڈا کبڈی یا کوئی

اور کھیل کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ انہیں تجربات کی بنا پر ہمیں کافی سبق مل چکا ہے کہ ہماری قومی مناقشات نہ تو اپنی قوم کی حمایت سے مٹ سکتے ہیں جیسا کہ ایک زمانہ میں مرا طرز عمل رہا ہے اور نہ ہی ایسے موقعوں پر ہمیں بجائے خود ایک مزاج دل اور معاملہ فہم ثالث کی حیثیت اختیار کر لینا چاہیئے بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان معاملات میں ہم اپنی قوم کی طعن و تشنیع سننے کے لئے طیار ہو جائیں۔ چنانچہ جب سے مجھے اور مرے بھائی کو ایسی ناگوار باتیں سننا پڑی ہیں میں محسوس کرتا ہوں کہ میں سچا محب الوطن بن رہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی مجھے امید ہوتی ہے کہ عنقریب متحد ہو جائیں گے۔ غالباً مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مری رائے میں مرے دوسرے دوستوں کو بھی یہی طرز طرز عمل اختیار کر لینا چاہیئے۔

سنگھٹن

اپنے رویہ کے متعلق اس تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے سنگھٹن کے متعلق کچھ زیادہ باتیں کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یقیناً کبھی علی الاعلان اس کی مخالفت نہیں کی اور اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو بہت ممکن ہے کہ یہ غلطی مری کسی تقریر یا ملاقات کی مسخ شدہ رپورٹ سے مرتب ہوئی ہو۔ اس معاملہ کا تعلق صرف مرے ہندو بھائیوں سے ہے اور اگر وہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو ہمیں اس میں مطلقاً دخل دینے کی ضرورت نہیں ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جماعت کے لئے جس اصلاح کو مناسب سمجھتی ہو اختیار کرے اور اگر سنگھٹن سے ہندوؤں کا مقصد صرف چھوت کا تدارک اور نیچ ذاتوں کو جس قدر جلد ہو سکے ہر طرح سے اپنی جماعت میں شامل کر لینا ہے تو اسلام اور کانگریس دونوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مرے لئے اس سے زیادہ اور کیا مسرت ہو سکتی ہے۔ جب سے ناگپور کانگریس نے ہندو نمائندوں سے

اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ہندو مذہب کو چھوت کے الزام سے پاک کرنے میں سرگرمی سے کام لیں اور اس غرض سے ان کے مذہبی پیشواؤں سے بھی پرزور درخواست کی ہے کہ وہ ہندو جماعت کی اس روز افزوں خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ وہ اچھوت اقوام کے متعلق اپنے رویّے کو بدل دینا چاہتے ہیں انہیں اس اصلاح کا موقعہ دیں یہ مسئلہ براہ راست کانگریس کا مسئلہ بن چکا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ۱۹۲۱ء کے آخری ایّام میں مہاتما گاندھی چھوت کو ہندوؤں کی خواہش آزادی کا امتحان سمجھتے تھے اور اگر اب ہندوؤں کی مذہبی جماعتوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس معاملہ میں اپنی جماعت کی اصلاح کریں تو یقیناً ہر خیال کے ہندو اور اس کے پیروؤں کو اس پر اظہار مسرت کرنا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں یہ معاملہ مدت سے نظر انداز تھا اس میں اس وقت تک کوئی خاص سرگرمی پیدا نہیں ہوئی جب تک کہ مالابار کے افسوسناک حادثات کے بعد پنجاب کے بعید گوشوں میں ناراضگی اور منافرت کی ایک عام لہر نہیں دوڑ گئی اور اس سے ملتان کے ہندوؤں نے مغلوب الغضب مسلمان بلوائیوں کے ہاتھوں نقصان نہیں اٹھایا۔ یہ حالات ہیں جو اس طرح باہم ملکر ہر ایسے ہندوستانی کے دل میں اضطراب پیدا کر دیتے ہیں جو ہندوستان کو متحد دیکھنا چاہتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان واقعات کے مقابلہ میں ان کا سابقہ اتحاد کس قدر کمزور ثابت ہوا ہے۔ لیکن ایک خام مادے پر جو ابھی اپنی پختگی کو نہیں پہنچا اس قدر زور دینا غلطی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم ہر افواہ اور بدگمانی پر توجہ نہ کریں لیکن ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر ان افواہوں یا بدگمانیوں کا فوراً ازالہ نہیں کر دیا جاتا تو اس سے فتنہ انگیزی کا کافی موقعہ مل سکتا ہے۔ بلاشبہ بعض لوگ بڑی سرگرمی کے ساتھ یہ بدگمانی پھیلا رہے ہیں کہ چھوت کو دور کرنے سے ہندوؤں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ نیچ ذاتوں کو اپنے اندر جذب کر لیں بلکہ آئندہ ہنگاموں میں انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال

کیا جائیگا۔ کیا یہ باتیں مہاتما گاندھی کے پیرؤوں کو بے چین کر دینے کے لئے کافی نہیں ہیں جنہیں قرار داد ناگپور میں بتاکید بتلایا گیا تھا کہ یہ کانگریس عدم اشتداد کو قرارداد ترک موالات کا ایک ضروری جزو تصور کرتے ہوئے اس پر خصوصیت سے زور دیتی ہے اور لوگوں کو اس امر کیطرف توجہ دلاتی ہے کہ حکومت ہو یا خود ہم دونوں صورتوں میں ہمیں اپنے اقوال و افعال میں عدم اشتداد کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے نیز اس کانگریس کی رائے میں اشتداد نہ صرف جمہوریت کی سچی روح کے نشوونما میں حائل ہے بلکہ اس سے ترک موالات کے دوسرے مدارج کا نفاذ بھی (بشرط ضرورت) مشکل ہو جائیگا۔

اگر اچھوت پن کے دور کرنے کی کوشش میں ہم نے جبر و جور کے قدیم طریقہ کا ہر استعمال شروع کر دیا تو یہ کیا تھا تاکہ دل کو نہ دکھایا گیا؟ ہمیں اچھوت ذاتوں کو اسکی محرومانہ حالت کی بنا پر اپنا دوست بنانا چاہیئے۔ نہ اس غرض سے کہ ہم دوسروں کو اس سے ضرر پہونچائیں۔ یا یہ کہ اپنی پچھلی مظلومیت کا بدلہ لیں۔

سنگھٹن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جسمانی صحت و ترقی کی طرف زیادہ دلچسپی پیدا ہو۔ یہ سب بہت مناسب ہے۔ اور اگر کمزوری و بزدلی ہندوستانیوں کے کسی طبقہ سے دور ہو سکتی ہے۔ تو یقیناً یہ باعث مسرت ہے۔ یہاں بھی بحروہی اصل نیت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور میں دل سے مسرور ہوں کہ گذشتہ ستمبر میں دلی میں صاف صاف مباحث نے پنڈت مدن موہن مالوی کو دنیا کے سامنے یہ اعلان کرنے کا موقعہ دیا۔ کہ وہ خود بھی مشترکہ اکھاڑوں کے مؤید ہیں۔ جس میں کہ ہر فرقہ کے نوجوان شریک ہو سکیں۔ جہانتک تحفظ جان و مال اور تعلق ہے کہ بہنوں کے حفظ ناموس کی بھی ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنا وہی اصلی مقصد ظاہر کیا۔ کیا آیا ذی وار مشترکہ "شہری محافظ" جماعتیں قائم کیجائیں۔ مالوی جی نے اگر اپنے صرف "ہندو دل"

بنا کر رکھا تو اُس کی وجہ محض یہ تھی کہ ہندو سبھا جس کے سامنے یہ تجویز پیش تھی۔
دوسرے فرقوں پر اس کے نفاذ سے معذور تھی۔ لیکن اب جبکہ ہندو لیڈران کی پوری
تائید کیساتھ ہندو مسلم اتحادی کمیٹی نے ان تمام مسائل پر چند قراردادیں قبول کرنے
کے لئے سفارش کانگریس سے کر چکی ہے۔ اور جبکہ کانگریس انہیں منظور بھی کر چکی
ہمارا کام صرف ان پر عمل کرنا رہگیا۔ نفاق کے مٹانے کے لئے سب سے پہلے ہمیں ہر
ضلع میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹیوں کے زیر نگرانی اور خلافت کمیٹیوں۔ ہندو سبھا۔
اور دیگر ذمہ دار انجمنوں کے مشورہ سے شہر کہ کمیٹیاں تمام ضلع کے اندر امن وحفاظت
کے قیام کے لئے بنائی جاہئیں۔ ایسے مواقع پر جبکہ کوئی واقعہ اس قسم کا پیش آجائے
جس سے امن وحفاظت میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔ تو یہ کمیٹیاں اُس کے مضر اثرات
کو کم کرنے کی کوشش کریں اور جلد سے جلد اطمینان وہ تصفیہ کی فکر کریں۔ اور لوگوں
کو اُس کی تعلیم دیتے رہیں کہ اشتعال کی حالتوں میں ضبط سے کام لیں۔ اور بجائے
خود آمادہ انتقام ہو جانے کے ان کمیٹیوں کی جانب رجوع کریں۔ اس کے بعد
سے میں نے اسے کمال رنج و افسوس کے ساتھ معلوم کیا ہے۔ کہ اکثر ضلعوں میں کانگریس
کمیٹیاں بالکل مردہ ہوگئی ہیں اور اکثر کارکنان کانگریس نے ان فرقہ دار جھگڑوں
میں سرغنائی کی۔ اس لئے ضروری ہے کہ کچھ عرصہ کے لئے نگراں کار جماعتیں
بنائی جائیں۔ جو ضلع کی کمیٹیوں کے کام کی جانچ کیا کریں۔ اور ایسے جگہوں میں
جہاں کہ اس قسم کی کمیٹیاں نہ ہوں یہی جماعتیں کام کریں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا
ہوں کہ ایک مستقل مجلس مفاہمت ہر ہر صوبہ نیز پورے ملک کے لئے ہونا ضروری
ہے۔ اگر اس قسم کے بورڈ قبل سے موجود ہوتے تو اکثر مقاموں پر جو فرقوں کا
آپس میں ناگوار تصادم ہوا ہے۔ روکا جا سکتا تھا۔ اگر باوجود ہمارے ان تمام
کوششوں کے پھر بھی آئندہ کہیں اس قسم کا واقعہ پیش آجائے۔ تو اسی بورڈ سے

تحقیقات کا کام بھی لیا جا سکیگا - اور اگر ضرورت ہوئی تو فریقین کے مدارج جرم
کا فیصلہ بھی اور ڈکر سکیگا - غرض ہمیں اپنے تمام سامان سے تیار رہنا چاہیئے اور
اگر لوگوں نے اچھی طرح یہ سمجھ لیا کہ ہم اس قسم کی بے عنوانیوں کو جڑ سے اکھیڑنا چاہتے
ہیں اور امن و حفاظت اور باہمی محبت دل سے قایم رکھنی چاہتے ہیں تو ہمیں اس
کی ضرورت ہی کیوں پیش آنے لگی، کہ لڑنے والے فرقوں کا فیصلہ کرنے بیٹھیں
دوسری چیز جو دلی میں کانگریس نے طے کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحت تمام مقامی
کمیٹیوں کو اس کی ہدایت کرے کہ وہ براہ راست اپنی ماتحتی میں اور اپنی نگرانی میں
مقامی شہری محافظوں، کی جماعت کا جس میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہو سکینگے
انتظام کرے اور قایم رکھے ۔! کہ وہ امن و اطمینان کو برقرار رکھے اور دیگر شہری
خدمات کو بھی انجام دے گا کانگریس کی مقامی کمیٹیوں کو بھی ہدایت کی گئی کہ وہ عوام
کو اپنی جسمانی تربیت کی طرف متوجہ ہونیکی رغبت اور ہمت دلائیں اور اس
مقصد کے واسطے وہ ان کے لئے ضروری سہولتیں بہم پہونچائیں تاکہ ہماری قوم
اپنی حفاظت آپ کر سکے - میں نے فرقہ وار دلوں اور اکھاڑوں کا ذکر سنا ہے لیکن
افسوس ہے کہ مقامی کمیٹیاں ابھی تک اتنا وقت نہ نکال سکیں کہ وہ کانگریس کی
طرف سے شہروں کی حفاظت کے لئے پولیس تیار کریں - اور کانگریسی اکھاڑوں
کا افتتاح کریں البتہ مجھکو اجمیر کے ایک جسمانی تربیت کے مدرسہ کا علم ہے جس نے
اپنے چند اراکین کو دہلی کی کانگریس میں بھیجا - میں انکی جسمانی صحت دیکھکر تو خوش
ہوا انہیں زیادہ مسرت اس بات کی ہوئی جب مجھکو معلوم ہوا کہ اجمیر کے منحوس ہنگامہ
میں باوجودیکہ ان کو ہم مذہب فریق کے ساتھ شریک ہو جانے کی بہت کچھ ترغیب
دلائی گئی اور ان کو تشدد کی جانب بہت کچھ کھینچا گیا لیکن یہ نوجوان بالکل عدم تشدد
پر قایم رہے اور شرکت سے بالکل انکار کر دیا - اس واقعہ کے بعد کیا کوئی کہہ سکتا

ہے کہ کانگریس اتحاد قومی اور عدم تشدد کے قیام کے لئے اپنے اثر کو بالکل
کام میں نہیں لائی۔ جہاں کہیں بھی ہمارے پاس ڈاکٹر رتن لال شسترجی۔ مولانا
محی الدین اور مرزا عبدالقادر بیگ جیسے آدمی موجود ہیں تاہم یقین کے
ساتھ آئندہ کے لئے قیام امن یا کم از کم جلد سے جلد بحالی امن کی
پوری امید رکھ ہی سکتے ہیں۔ یہ سنکر خوش ہوا کہ ڈاکٹر ڈیکر نے ایک والنٹیر
کور تیار کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور دوستو! مجھے صاف کہنے دو کہ آج
مجھے بھی جبکہ میں کانگریس کی صدارت کا کام انجام دے رہا ہوں یہ محسوس کرتا
ہوں کہ اس سے بہتر کام ڈاکٹر ہارڈیکر کی جگہ پر رہ کر کر سکتا تھا۔ اگر گورنمنٹ
کو صرف اس کا احساس ہو جائے کہ ہماری کمیٹیوں اور جلسوں کو اب سے بھی
زیادہ پر امن و منظم بنانے کے لئے ہمیں والنٹیروں کے دستہ کی کتنی ضرورت ہے
تو اسے وہ خلاف قانون قرار دینے کا خیال تک نہیں کر سکتی بشرطیکہ اُسے بھی
واقعتاً حفظ امن مقصود ہو۔ اس معاملہ میں میری ایک شخصی غرض بھی شامل
ہے وہ یہ کہ مجھے جس طرح لگاتار سفر میں رہنا پڑتا ہے، جلسوں میں جس کثرت
کے ساتھ شرکت کرنا پڑتی ہے، اور بدقسمتی سے جس افراط کے ساتھ میرے جلوس
نکلتے ہیں، ان تجربات کی بنا پر میں اس قسم کے دستے کی جتنی ضرورت محسوس کرتا
ہوں اس کا اندازہ خانہ نشین حضرات کر ہی نہیں سکتے۔ بعض دفعہ تو ان مواقع
پر بے اختیار میرا یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ مقامی والنٹیروں کی کمان اپنے ہی ہاتھ میں
لے لوں مگر معاً یاد پڑ جاتا ہے کہ کوئی شخص خود اپنی ہی تجہیز و تکفین کا اہتمام
نہیں ہو سکتا۔ لیکن قبل اسکے کہ میں مسئلہ سنگھٹن کو ختم کروں مجھکو عورتوں
کے ناموس کی حفاظت کے مضمون پر کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ پہلے یہ
کہہ لینے دیجئے کہ الفاظ آئندہ میرے نہیں بلکہ میری بیوی کے ہیں۔ المورڈہ میں

تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا :- الموڑہ میں ایک زنانہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے جن میں سب کے سب ہندو بہنیں ہی تھیں انہوں نے کہا کہ "اگر الموڑے جیسے مقام پر جہاں مسلمان بہت ہی کم ہیں مسلمانوں کے خلاف بلوہ ہو جائے اور میرے رشتہ دار مردوں میں کوئی میری اور میری لڑکیوں کی حفاظت کے لیے موجود نہ ہو تو جو ہندو پہلے ملیگا چاہے وہ بدمعاش ہی کیوں نہ ہو میں اُس سے اُسی طرح مدد مانگونگی جیسے کوئی بہن اپنے بھائی سے مانگتی ہے اور اس سے کہوں گی کہ وہ میری اور میرے بچوں کی آبرو کی حفاظت کرے" مجھے ہندوستان کے بدمعاشوں تک کے پاس عزت پر پورا بھروسہ ہے اور میری رائے میں ایسے بدمعاش ہندوستان میں مشکل سے ملیں گے جن کے دل پر کسی مبتلائے مصیبت بہن کی فریاد کا اثر نہ ہو دوستو! اعتماد بسا اوقات بدی کے مقابلے میں سپر کا کام دیتا اور جہاں چونالے اور چپلے طبنچے کام نہیں آتے وہاں جان بچاتا ہے شیکسپیر جو ہم میں بہت سے آدمیوں سے زیادہ طبائع انسانی سے واقف تھا لکھتا ہے "بدترین چیزوں میں بھی نیکی کی روح موجود ہے"

میں اپنے بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ایک دوسرے پر اسے زیادہ اعتبار کرنا سکھائیں اور اپنے باہمت اعتماد کے مثال سے ہم میں سے بڑے سے بڑے کے دل میں بھی نیکی کی روح کو تقویت دیں۔

شدھی

ایک دوسری تحریک جس نے ہندو مسلم تعلقات پر خراب اثر ڈالا ہے شدھی ہے میرا مذہب خود تبلیغی مذہب ہے۔ تبلیغی مذہب وہ ہے جس میں یہ الفاظ پروفیسر میکسمولر سچائی کی ساتھ دیکھے۔ مذہب والوں کو اپنے مذہب میں لانے کا کام ایک

ایک مقدس فرض کے درجے تک پہنچ جائے۔ کسی مذہب کے متبعین کے دل میں تبلیغ کا خیال۔ سچائی کی ایسی روح ہے جسے اس وقت تک قرار نہیں آتا جب تک خیالات الفاظ اور افعال کے ذریعہ سے اپنے آپ کو ظاہر نہ کرے۔ ایک دھن ہے جو اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک وہ پیغام جو اس مذہب کے متبعین کے نزدیک حق ہے دنیا کے ہر متنفس کے کان تک نہ پہنچا دے۔ مسیحیت۔ بدھ مذہب اور اسلام تبلیغی اور یہودی۔ زرتشتی اور ہندو مذہب عموماً غیر تبلیغی مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔

ہندو مذہب کے خلاف ایک عرصے سے مجھے یہ شکایت ہے اور ۱۹۰۶ء میں ایک مرتبہ بمقام الہ آباد دوران تقریر میں نے ہندو مسلمان کا فرق دکھلاتے ہوئے کہا تھا کہ مسلمان کے متعلق بڑے سے بڑا جو کچھ کہا جا سکتا ہے یہی کہ اس کے پاس ایک روکھی پھیکی غذا ہے جسے وہ کہتا ہے کہ بادشاہوں کے کھانے کے لائق ہے وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اُسے کھائے یہاں تک کہ جو لوگ اُسے بے مزہ کہتے ہیں اور کھانا نہیں چاہتے اُن کے حلق سے بھی اُتارنا چاہتا ہے بخلاف اس کے ایک ہندو ہے جو اپنے کھانے کی تو صد درجے تعریف کرتا ہے مگر اپنے چوکے کے گوشہ تنہائی میں جا کر اپنے پکائے ہوئے کھانے کو خود ہی کھا لیتا ہے اور دوسرے کو ایک لقمہ تک نہیں دیتا بلکہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی کا اس پر سایہ تک پڑ جائے۔ میں نے جو کچھ کہا تھا وہ محض مذاق ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک دفعہ میں نے چاہا تھا جی سے واقعی دریافت کیا کہ اپنے مذہب کے اس پہلو کو اچھی طرح میرے ذہن نشین کر دیں۔ ایسی حالت میں تعجب ہوگا اگر آج میں ہندوؤں میں تبلیغی رجحان دیکھ کر اُن کے اشاعت مذہب کی کوششوں پر ناراضی کا اظہار کروں۔ میں اس سے زیادہ کہوں گا کہ اگر ملکانہ راجپوت حقیقتاً اسلام سے اس درجہ نا واقف ہیں کہ وہ ہندو قرار دئے جا سکتے ہیں تو ہندو مبلغین کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ [illegible]

نے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر جگا دیا اور اُن کا فریضہ مذہبی یاد دلا دیا کہ وہ اُن لاکھوں مسلمانوں کی خبر لیں جن کا علم اور عمل دونوں برائے نام ہیں۔ چاہئے یہ کہ مسلمان اور ہندو دونوں اپنے اپنے مذہب کے تبلیغ اور احکام مذہب کی تعمیل میں مطلق آزاد ہوں۔ دنیا میں تربیت کے مختلف مسالک ہیں جن میں باہم مقابلہ ہے اور ہر ایک میں تبلیغی مادہ موجود ہے اور ہم ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جس میں ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ذمہ داری سے انتخاب مسلک کرے۔ ہمارے یہ خواہش یقیناً نہ ہونی چاہئے کہ اس آزادانہ رد و قبول کے زمانے میں چھوٹے مذہب کا استرداد اس کے متبعین کی استیصال کے ذریعہ سے کیا جائے۔ مدت ہوئی کہ اسپین کا محکمہ احتساب مذہبی ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا اس لئے اب کسی کو خیال بھی نہ کرنا چاہئے کہ کافروں کو مٹا کر کے کفر کی صفائی ہو سکتی ہے۔ اشاعت و ترقی مذہب کی آسان اور صحیح شکل یہ ہے کہ مذہب کی تلقین و تبلیغ کی جائے اور جس شخص کو تلقین و تبلیغ کی جائے اسے آزادی دی جائے کہ اگر وہ مطمئن ہو جائے تو اُسے خوشی سے قبول کرے۔ بعض متعصب موپلاؤں کے متعلق یقین کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فسادات مالابار کے زمانے میں چند نایروں کے چوٹیاں کاٹ ڈالیں۔ اگر ایسا ہوا تو کون سچا اور مذہب سے باخبر مسلمان اس جبری تبدیلی مذہب پر خوش ہوگا۔ اگر کسی پر ناواجب دنیوی دباؤ ڈال کر اُسے ظاہر حالت بدلنے پر مجبور کیا جائے تو خدا کی نظر میں ایسی تبدیلی پسندیدہ نہیں اس قسم کے دباؤ کے الزامات زمینداروں مہاجنوں اور کثیر التعداد ہندوؤں پر ڈیرہ غازی خان اور اس کے جوار کے علاقہ میں قائم کئے گئے جن کا رد کیا ہوا اور ان کے جواب میں بھی الزامات لگائے گئے۔ سوائے اس کے کہ ایسا کا قومی اتحاد پر مضر اثر پڑے اور کچھ نہیں اور جبکہ وہ فیصلہ جس سے کہ تمام مستقل کوئی اور بہتر طریقہ ہائے تبدیل مذہب اور بازآوری کی جا سکتے تھی۔ ایک معمولی مسئلہ کی

بنا پر ترک کر دیا گیا - ہند و مسلم اتحاد کی کمیٹی نے دہلی میں کانگریس سے ایک
قرار داد کی سفارش کی ہے جو منظور بھی کی جا چکی ہے - کہ ایک کمیٹی مرتب ہو
جو واقعات شدہ اور غیر شدہ کی تحقیقات کرے اور اُن مقامات کا دورہ کرے
جہاں جبر و تخویف اور غیر مناسب دباؤ یا اثر استعمال کیا گیا ہو یا جہاں شدھ کرانے
یا دین میں لانے کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے گئے ہوں یا ان کا شبہ ہو کہ جو
اصل مذہبی مقصد سے بالکل بعید ہو - اور اس قسم کی بے عنوانیوں کو روکنے کے
لئے جو تدبیر مناسب سمجھے پیش کرے - یورپ کی ہر ایک سیاسی جماعت اپنی عزت
برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ متفکر رہا کرتی ہے کم سے کم اس کا دعویٰ تو کرتی ہی ہے
اور بظاہر جس قدر اپنی عزت کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوتی ہے اسی قدر اپنے دشمن
کی قوت کو ضرورت سے زیادہ نہ بڑھنے دینے کے لئے قانون کارروائی ہائے
ناجائز کو مجلس واضع قوانین میں پاس ہونے کے لئے اپنی رضامندی دے دیتی ہے ہم
اپنی نیکنامی کے لئے فی الحقیقت فکر مند ہونا چاہئے - اس معاملہ میں ایک
سیاسی انجمن مثل ہماری کانگریس کے اگر وہ قانون کارروائی ہائے ناجائز
کو بجز نافذ نہیں کر سکتی تو بطور غیر منضبط قومی قانون کے تمام فرقوں کو مشورہ دینے
کا صحیح مجاز ضرور رکھتی ہے - دونوں قومیں یکساں طور سے دہ سالہ مردم شماری
پر بہ نسبت خدا پر بھروسہ کرنے کے زیادہ زور دے رہی ہیں اور میں بلا تکلف تسلیم
کرتا ہوں کہ انہیں مواقع پر میں ان قدیم ایام کے لئے قائم کرتا ہوں جبکہ ہمارے
آباو اجداد معاملات کو ٹھیک کرنے میں شمار کرنے سے سروں کے قلم کرنے کو
ترجیح دیا کرتے تھے -

دوبارہ میں پھر عرض کروں گا کہ سب سے بہتر اور سب سے موثر علاج یہ ہے کہ تبلیغ
مذہب کے مفہوم کو بالکل ہی بدل دیا جائے - ان حالات میں واقعی اس کی کیونکر

امید کیجا سکتی ہے جبکہ صحایف واخبارات ایسی بیباکانہ طرفداری برت رہے ہیں
جیسا کہ آج ہندوستان کے اکثر حصوں میں عیاں ہے۔ میں خود ایک صحیفہ نگار
ہوں اور آپ سب کو علم ہے کہ میں نے ہندوستانی اصولات کی آزادی کے
حصول کی خاطر کسقدر مصائب بھی برداشت کئے ہیں۔ کم از کم میں عزت کا اگر
وہ کوئی عزت ہو سکتی ہے تو دعویدار ضرور ہو سکتا ہوں کہ میری مثال مرحوم قانون
مطابع کی ماتحت خاطر خواہ نمایاں رہی ہے۔ اور میں ہی وہ تھا جس نے اس لوہے کی
کوٹھی کا راتھا مگر زد میں نہ آسکی۔ ان آہنی ہتھکڑیوں کے اتارنے سے یہ امر اور اہم
ہو جاتا ہے کہ ہمیں اپنے اوپر اب پیشتر سے زیادہ قابو رکھنا چاہیئے۔ لیکن جو کچھ
کہ میں نے پنجاب کے اردو اخبارات میں دیکھا ہے اوس سے تو مجھے خوف ہوتا
ہے کہ اگر ان اخبارات کو کانگریسی اشخاص کی متفقہ کوششوں سے روکا نہ گیا
تو ہمیں ایک دن اُس مردہ و مطعون قانون مطابع کے دوبارہ اُٹھانے کے لئے
آہ و بکا نہ کرنی پڑے۔ نہ صرف یہ کہ موجودہ حکومت کو پنجابی اخبارات میں کافی مصالحہ
ملیگا جس کے لئے اگر قانون مطابع کو دوبارہ زندگی نصیب ہو تو بآسانی اس
قانون کی دفعات کو استعمال کر سکیگی کیونکہ جو جرم بموجب تجویز دفعہ ۱۵۳ الف
تعزیرات ہند کی ماتحت قابل سزا ہے وہ دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند کی ماتحت قابل
سزا نہیں ہے۔ اور گو کہ اب قانون مطابع کا نفاذ نہیں رہگیا ہے تاہم تعزیرات ہند
اور دیوانی کی عدالتیں حکومت کے مقصد برآری کے لئے کافی ہیں۔ جہاں کہ
سرکاری عمال جنھیں حکومت سے بدیں غرض مالی امداد بھی دیجا سکتی ہے ازالہ
حیثیت کا دعوی کر سکتے ہیں۔ لیکن قوم کے تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہے پس
ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ ہم اس کی خوب پردہ دری کریں۔ یہ صرف میری ہی
[illegible] ہندو مسلم کمیٹی سے [illegible] درخواست

کی تھی کہ وہ کانگریس سے اس قسم کی قرارداد کی سفارش کرے جس کی رو سے کانگریس اپنی مجلس عاملہ کو یہ ہدایت کرے کہ وہ ایک اعلان شائع کرے جس میں تمام ہندوستانی اخبارات کو توجہ دلائی جائے کہ ایسے مسائل پر جن سے فرقہ وار تعلقات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو یا ایسی خبروں یا واقعات کے شائع کرتے وقت یا اُن پر تبصرہ و رائے زنی کرتے وقت انتہائی ضبط سے کام لیں اور اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ ایسا رویہ اختیار نہ کریں جن سے ہندوستانی مفاد کو صدمہ پہونچے۔ یا مختلف فرقوں کے تعلقات ناخوشگوار نہ ہو جائیں۔ کانگریس سے اس امر کی بھی سفارش کی گئی تھی کہ وہ اپنی مجلس عاملہ کو ہدایت کرے کہ ہر صوبہ میں چھوٹی سی ایک ایسی کمیٹی بنا دے کہ جو اپنے صوبہ میں اُن متعین اخبارات سے درخواست کرے جو اس قسم کی بات شائع کریں جن سے باہمی تعلقات کے کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہو کہ وہ اس فعل سے باز آویں۔ اور اگر اس دوستانہ مشورہ کا کوئی سودمند نتیجہ حاصل نہ ہو تو وہ اُن اخبارات کے نام کا اعلان کر دے اور اگر اس پر بھی ان اخبارات کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو بالآخر کانگریس کی طرف سے اُس اخبار کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جائے۔ کانگریس نے اس تجویز کو بھی منظور کر لیا تھا مگر مجھے اندیشہ ہے کہ مجلس عاملہ کو کانگریس کی ان ہدایات پر عمل کرنے کی شاید اب تک فرصت نہیں ملی۔ سب سے اہم کام جو اس وقت ہمیں انجام دینا ہے علاوہ ہندو مسلم اتحاد کے برقرار رکھنے کے۔ وہ یہ ہے کہ کانگریس کا ایک مستقل عملہ منظم کر لیا جائے نیز کانگریس کی صوبہ وار مقامی کمیٹیاں پھر درست کی جائیں کیونکہ اس سے کچھ فائدہ نہیں کہ کانگریس تو تجاویز منظور کر دے مگر مستقل تنخواہ دار عملہ نہ ہونے کی وجہ سے اور کارکنان کے اعزازی ہونے کے سبب سے اُن پر عمل نہ کیا جا سکے۔

دوستو! شاید آپ یہ کہتے ہوں کہ میں نے دہلی کانگریس پر بیٹھ کر جو کچھ کہا تھا اُس کو

بالتفصیل بیان کرنے میں آپ کا بہت سا وقت لے لیا لیکن اب تک آپ کے سامنے بمشکل کوئی نئی تجویز پیش کر سکا ہوں۔ میرے پاس اس کا جواب تو صرف یہ ہے کہ اگر آپ نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اُن تجاویز کو جنھیں آپ نے اس وقت منظور کیا تھا تکمیل کے درجہ تک پہنچا دیجئے تو آپ کو شاید اس وقت کسی نئی تجویز کی بالکل حاجت نہ ہو گی۔ دلی میں ہم نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم موجودہ صورت حالات سے مطمئن نہیں اور ہم نے عہد کیا تھا کہ ہم متحد رہیں گے۔ ان چیزوں یا ایک حد تک مطلع کو صاف بنا دیا تھا لیکن یہ کافی نہ تھا۔ ہم نے اپنی قومی بدبختیوں کے ایسے علاج ضرور تجویز کر لئے تھے جو فی الحقیقت اصولاً معقول تھے لیکن افسوس کہ ہمیں اس کا وقت نہ ملا ہم اُن تجاویز پر عمل بھی کرتے ہم نے دلی کی قراردادوں کو جانچنے میں۔ اُن کو پرکھنے میں اور اُن پر نکتہ چینی کرنے میں بہت کافی وقت خرچ کر لیا۔ دوسری طرف کانگریس والوں کی ایک کثیر تعداد انتخابات میں منہمک رہی۔ تاوقتیکہ تم دوسری تجاویز قومی اتحاد کے قایم رکھنے کے لئے طے نہ کر لو تمھاری جماعت عاملہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان تجاویز پر کاربند ہو جو منظور ہو چکی ہیں۔ لیکن آپ کی مجالس عاملہ کسی امر کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ آپ اُسکی پوری پوری مدد نکریں اور ساتھ نہ دیں، درحقیقت آپ خود اپنے سب سے موثر عامل ہیں۔ بطور آپ کے خصوصیت کے ساتھ منتخب کردہ خدمتگذار ہونے کے جس کو آپ نے سال بھر کے لئے نامزد کیا ہے جس کی اس وقت ابتدا ہے۔ میں آپ سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ خود اپنے منظور کردہ احکامات کی تعمیل میں میری مدد فرمائیے ہندوستان کے اخبارات سے میری ناچیز درخواست یہ ہو گی کہ وہ موقعہ اور وقت کی اہمیت کا اندازہ کریں اور اُس شخص کی امیدوں کو پامال نہ کریں جو خود ایک صحیفہ نگار رہ چکا ہے۔ ابھی حال میں جب میں بیجاپور میں تھا۔ اور سب سے

پہلا موقعہ تھا جبکہ میں نے وہاں کا مشہور گنبد دیکھا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو میری طرح اُس عجیب غریب عمارت کو دیکھ کر متحیر تھے مجھ سے تبسم کے ساتھ جو سارے گنبد میں گونج گیا کہا کہ کیا یورپ کے پاس باوجود اپنی تمام مفاخر فضیلت کے کوئی ایسی عمارت ہے جس میں سطح آہستہ آواز بازگشت ہو کر بلند ہو جیسے یہ گول گنبد؟ بلاشبہ یہ ایک بہت تعجب خیز تجربہ تھا کہ جو کچھ بھی آہستہ سے آہستہ وہاں کہا جاتا تھا باوجود وسیع بعید فاصلے کے بخوبی سنائی دیتا تھا اور نوگونجیں صاف سنائی دیتی تھی جو بہت ہی قابل تعریف ہے۔ میرے دوست کچھ لمحے تک بیجاپور کے شاندار ماضی کے تصور میں گشت لگاتے رہے اور اپنے مسلمان اسلاف کے انتہائی شان و شوکت کو یاد کرتے رہے۔ اُن کے خیالات کو درحقیقت بڑی ضرب لگی جب میں نے آہستہ سے یہ جواب دیا کہ یورپ کے پاس جو اس قسم کی چیز ہے وہ تو اور بھی زیادہ عجیب و غریب ہے اور پھر میں نے بتلایا کہ یہ "شیطانی ڈھول" یورپ کے اخبارات ہیں یعنی یورپ کا حکمران طبقہ چہارم ہر ایک جھوٹ یا دروغ جو مدیر یا مالک اخبار کے خلوت گاہ میں آہستہ سے آہستہ بولا جائے گا اپنی قوت میں اور اپنی جسامت میں ہر گونج کے بعد ترقی کرتا ہوا سارے بر اعظم میں پھیل جائے گا یہاں تک کہ انسانوں کے آہ و نالوں میں جا کر ختم ہوتا ہے اور بیچاری غریب منہ بند صداقت کی کوئی نہیں سنتا۔ تاہم فریب کے افسردہ نالوں کی طرح سچائی کی گرج گنجا دینا ویسا ہی آسان ہے؛ اب یہ ہندوستان کے اخبارات کے ذمہ رہ جاتا ہے کہ آیا وہ اپنے اخبار کو سچائی اور راستی کا صور پھونکنے میں استعمال کریں گے یا جھوٹ اور فریب کا۔

سوراج اور ممالک غیر کی فوج کشی

قبل اس کے کہ ہندو مسلم سوال کو بالکل ختم کروں میں یہ اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان
سوراج حاصل کر لینے کی حالت میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کے لئے
پورا پورا ممد اور مؤید رہے گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ "سوراج" کے معنی "سرو راج"
یا "سب کی حکومت" کے ہیں۔ اور لفظ "سوراج" "سوا دھرم" کے اصول پر
دلالت کرتا ہے۔ جس کا صحیح مفہوم صرف مشرقی ممالک ہی پوری طرح ادا کر سکتے ہیں۔ یہ
امر لازمی نہیں کہ دلی کے مغلیہ تخت پر کوئی مسلمان بیٹھے۔ ہم سب نے ابھی دیکھا ہے
کہ کس طرح ایک عظیم الشان اسلامی حکومت تخت شاہی کا خاتمہ کر کے جمہوریت میں تبدیل
ہو گئی۔ ہر ایک زمیندار مسلمان خلفائے راشدین کے تیس سالہ عہد کو اپنے لئے نمونہ
بناتا ہے جو یا وجود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور امیر المومنین ہونیکے
جمہور کے خالص اور سچے خدمتگذار تھے۔ اسلام مہذب دنیا کے بڑے حصہ پر پھیلا تھا
اور اس کی حکومت تمام معلوم بر اعظموں تک پھیل گئی تھی۔ لیکن کوئی مسلمان اس
آخری عروج کے زمانہ کو اتنا عزیز نہیں رکھتا جتنا کہ اس کو ابتدا کے تیس سال سے
گرویدگی ہوتی ہے۔ جبکہ ایک مسلمان ایلچی ایک بازنطی یا ایرانی ایلچی نے جو اپنے
مطلق العنان حکمرانوں پر ناز کرتے تھے یہ فخریہ کہتا ہے کہ مسلمان اپنے حکمرانوں کو خود
ہی مقرر کیا کرتے ہیں اور خود ہی معزول کر سکتے ہیں۔

فتح کو نیا ور اور خدا ترس ترکوں نے شکست و نا امیدی سے جو سبق لیا ہے
اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ ان ترددات سے جو جنگ و صلح دونوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں فارغ
ہو جائیں گے تو وہ خدا کی اعانت سے نہ صرف امیہ اور عباسیہ کی شان و شوکت کو زندہ
کریں گے بلکہ وہ خلافت کے ابتدائی تیس سال کی یاد کو تازہ کر دیں گے جس میں نہ تو

کوئی حاکم یا سلطان تھا۔ ممالک اسلامی اور خلیفہ کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے متعلق میرے اپنے خیالات ہیں لیکن ان کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ جب تک وہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اور اَمَرَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ کے قائل رہیں گے کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کا دینی حکمران کون ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام میں بھی بعض ایسے امور ہیں جن کا کرنا اور بعض ایسے ہیں جن کا نہ کرنا ہر مسلم کے لئے ضروری ہے۔ ان اوامر و نواہی کے درمیان ایک صورت مباح کی ہے جس میں بجز ان امور کے جن کو ترجیح حاصل ہے ہر شخص کو پورا اختیار حاصل ہے۔ اس کے بعد ایک مسلمان کسی ایسے مخلوق کی اطاعت نہیں کر سکتا جو ان اوامر و نواہی کے منافی حکم دیتا ہے خواہ وہ شخص اس کے والدین میں سے ہو یا اس کا آقا یا حاکم ہو خواہ وہ اس کا دوست ہو یا دشمن اور خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ جب تک کہ اسلام کی دنیوی قوت کافی ہو اور خلیفہ کے ہاتھ میں ہو، اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ ایک مسلمان اسلامی حکومت کے رعایا میں سے ہے یا غیر اسلامی حکومت کی۔ جس چیز کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی امور میں احکام الٰہی کی پابندی کے لئے اسے پوری آزادی حاصل ہو۔ ایک مسلمان حاکم کیا معنی اگر خود خلیفہ اسے خدا کی نافرمانبرداری کا حکم دیتا ہے تو اسے قطعی انکار کر دینا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ جو خدا کے لئے واجب الادا ہے، اسے وہ ایک غیر مسلم قیصر کو کیونکر دے سکتا ہے ایسی صورت میں میں نہیں سمجھتا کہ سوراج اور ہم مذہب حکومت کے ساتھ مسلمانوں کی مستقل وفاداری کا سوال کیوں اٹھتا ہے۔ اب رہا امیر افغانستان کے ہونے کا سوال کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ یہ خوف اور بزدلی کی علامت ہے جو صرف جرأت و ہمت اور ایک دوسرے پر اعتماد کرنے سے رفع ہو سکتی ہے پنڈت جواہر لال کا یہ فقرہ سنکر میرا دل بہت خوش ہوا کہ "پہلے ہم سوراج حاصل کر لیں، پھر دیکھیں کون آتا ہے"۔ ہم یقیناً ہر حملہ آور کے مقابلہ کے لئے تیار رہیں گے اور ایک

ایسی قوم کے ہاتھ سے جس نے ڈیڑھ سو برس کی غلامی کے بعد حاصل کیا ہو، آزادی کا چھین لینا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ رہا میرا سوال اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ جس دن ہندوستان کو کسی حملہ آور سے مقابلہ کے لئے خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، مجھ سے عاجز سپاہی کی ضرورت ہوگی، تو آپ کا یہ رفیق جسے آپ نے آج صف جنگ سے باہر بلا لیا ہے، پھر خوشی کے ساتھ اپنی صف کی خالی جگہ کو پُر کر لیگا۔ یقین جانئے کہ وہ آپ کی رفاقت چھوڑنیکا نہیں

میں نے سنا ہے کہ میری ۱۹۲۱ء کی مدراس والی تقریر جس میں سرکاری حلقوں میں بہت سخت باغیانہ خیال کی گئی ہے اس تقریر میں ان جذبات سے نہ تو کچھ کم تھا نہ بیش جس میں میرے بھائی اور میں نے اپنے اس خط میں ظاہر کئے تھے جو بیتول جیل سے وائسرائے کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، یہ خط ایسا تھا کہ خود افغانستان میں بھی کچھ مقبولیت کی نظر سے نہ دیکھا جاتا اور اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان کے لوگوں کو یہ سن کر تکلیف ہوتی ہوگی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر ہم کو صرف اتنا معلوم ہوتا کہ ہز مجسٹی امیر افغانستان کو خود اپنی حکومت کی تنظیم اور بلا امداد غیرے وہاں کے ذرائع آمدنی کی ترقی دینے میں کس قدر دشواریاں حایل ہونگی۔ ان کی اور ان کی گورنمنٹ کو مصروف رکھنے کے لئے افغانستان اس قدر کافی ہے کہ وہ اس بیرونی مسئلہ پر کہ کابل کا ٹٹو ہندوستان کے ہاتھی کو کیونکر نگل سکتا ہے، مزید غور کرنے کی مہلت ملے۔ افغانستان کے اس مفروضہ حملہ کی صورت میں میں نے جو اپنی حیثیت بتائی ہے اس پر اگر افغانیوں کو تکلیف پہونچی ہو تو اس صورت میں خود میرے جذبات کیا ہونگے۔ میں مسلم ہوں اور اس لئے ہندوستانی ہونے سے موقوف نہیں ہوا اور فی الحقیقت یہ کسی ہندوستانی کے قومی افتخار کے لئے باعث ذلت ہے کہ اس کے ہموطن اپنے ملک کو باہری حملہ آور کا خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو شکار خیال کرتے ہوں۔ دوستو! معاف کیجئے اگر میں یہاں پر ایک قصہ بیان کردوں جو ہمارے حالات کے بالکل مناسب ہے لیکن ساتھ ہی اس کے مجھے اپنے بنیا احباب

سے خاص طور پر معذرت بھی چاہتی ہے کیونکہ خواہ اس قصہ کا مصنف کوئی بھی ہو وہ اس زمانہ سے کہیں پیشتر رہا ہے جبکہ آج ہندوستان کے سب سے بہادر لیڈر ایک بنیا اور ان کے خاص رفقا اور محبوں میں "میرا بہادر بنیا" جسے میں اپنے رفیق سیٹھ جمنا لال بزاز کے نام سے پکارتا ہوں۔ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار چار مسافر ایک سڑک پر ملے اور یہ طے کیا کہ ایک ساتھ ملکر سفر کریں گے تاکہ ایک دوسرے کی حفاظت کر سکیں۔

...... جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے حملہ آور بھی چار ہیں تو ان میں سے ایک نے جو راجپوت تھا' اپنے ایک پٹھان ساتھی کے کان میں کہا کہ "میں سب سے مضبوط لیٹرے سے نپٹ لونگا" اس پر پٹھان نے راجپوت کو اطمینان دلایا کہ "میں دوسرے ڈاکو سے جو اس سے دوسرے نمبر کا ہے لڑ لوں گا" اس ہمت افزائی نے تیسرے ساتھی سے جو ادھیڑ سا برہمن تھا یہ کہوایا کہ "پھر تیسرے کو میں گرا لوں گا' اب چوتھے شخص کی باری آئی جو بنیا تھا' اس کی زبان سے نکلا' تو یہ نکلا کہ "چوتھا مجھے مار لیگا" یہ سنکر برہمن کو اندیشہ ہوا کہ اس حالت میں اسے ایک نہیں بلکہ دو سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ہمت ہار دی' اس طرح پٹھان نے بھی ہمت ہار دی کہ اسے تین حملہ آوروں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ آخر کار راجپوت بھی مایوس ہو گیا۔ کیونکہ ظاہر ہے وہ ان چاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ انجام صرف اس وجہ سے ہوا کہ چار میں سے ایک مسافر کو اتنا ہی یقین تھا کہ چوتھا رہزن اسے فنا کر دیگا۔ حتیٰ کہ اس کے تین ہمراہیوں کو علحدہ علحدہ ہر ڈاکو کو گرا لینے کا یقین تھا۔ میرے دوستو! کیا میں آپ سے اب یہ نہیں پوچھ سکتا کہ آیا جنگ میں شریک ہونے سے پہلے شکست کے یقین کو دور کرنے کا ہنوز وقت آیا یا نہیں۔ جبکہ ہمارا بہادر رہنما بھی ایک بنیا ہے' کیوں نہیں؟ ابھی حال ہی میں دلی کے ایک اخبار نے اپنے خفیہ مخبر کے قابل ذکر انکشاف کو شائع کیا ہے کہ دو سن رسیدہ اور ایک نوعمر عربوں کا ایک وفد (جو فلسطین سے حکومت ہند کی اجازت

سے محض اس غرض سے آیا ہے کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کی عمارتوں کی مرمت کے لئے جو بیت المقدس ہیں، چندہ جمع کرے) عربوں کی ایک حملہ آور فوج کا ہراول ہے جو اپنے ملک کو ان آوارہ گرد یہودیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے جو منتشر ہونے کے بعد پھر یہوں واپس آرہے ہیں۔ اس خوف و بدظنی اور گھبراہٹ سے آزادی نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔ دوستو! اس طرح جو ہمارے پاس ہے وہ بھی جاتا رہیگا۔ اس موقع پر جو لعنت خدا نے اسرائیل پر بھیجی تھی وہ مجھے یاد آئی ہے اور وہ توریت کتاب استثنا میں یہ مذکور ہے۔

خداوند اُن سارے کاموں ہیں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگاوے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کریگا۔ یہاں تک کہ تو ہلاک ہو جائے گا اور جلد نابود ہو جائے گا۔ خداوند ایسا کرے گا کہ تو اپنے دشمنوں کے آگے مارا جائے اور تو ایک راہ سے ان پر چڑھ جائیگا اور اُن کے آگے سات راہوں سے بھاگے گا۔ اور زمین کی ساری مملکتوں میں تیرے لئے پریشانی ہوگی۔ اور تیری لاش ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہو جائے گی اور کوئی اُن کا ہانکنے والا نہوگا۔

اور خدا تجھ کو دیوانہ پن نابینائی اور دل کی حیرت سے ماریگا۔

اور جس طرح اندھا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے تو دوپہر کو ٹٹولتا پھرے گا اور تو اپنی راہوں میں کامیاب نہوگا اور تجھ پر ہمیشہ ظلم ہی ہوگا اور تو لوٹا جائیگا اور کوئی تیرا بچانے والا نہ ہوگا۔

تو ایک مکان بنائے گا اور تو اس میں نہیں رہ سکے گا اور تو ایک انگور کا باغ لگائے گا اور تو اسکے انگور نہ کھا پائے گا۔

تیرے بیٹے اور بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہوگا۔

یہاں تک کہ تو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے دیوانہ بن جائے گا اور تو اُن

سب قوموں میں جہاں جہاں خداوند تجھے لے جائیگا حیرانی کا باعث اور ضرب المثل اور لعنت نشانہ ہوگا۔

پردیسی جو تیرے درمیان ہے تیری بہ نسبت نہایت سرفراز ہوگا اور تو نہایت پست ہو جائیگا وہ تجھے قرض دیگا اور تو اس کا قرض نہ دے گا وہ سر ہوگا اور تو دُم ہوگا محملاً یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تیرا پیچھا کریں گی اور تجھ تک پہونچیں گی یہاں تک کہ تو ہلاک ہو جائیگا۔

اور یہ لعنت تجھ پر اور تیری نسل پر نشانی اور حیرت کے لئے ابد تک ہوگی۔

مسلمانوں کے دوگونہ فرائض

اس وقت مسلمانوں پر دوہرے فرائض عاید ہوتے ہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ان کی ذات پر یہ قرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنی نسلوں کے لئے آزادی حاصل کریں۔ ہندوستان مسلمانوں کا بھی ویسا ہی ہے جیسے ہندوؤں کا اور اگر ہندو ان قربانیوں سے جان چرائیں جو آزادی کی جنگ کے لئے لازمی ہیں تب بھی ان کا یہ فرض ہوگا کہ ثابت قدم رہیں اور کہیں کہ باقی ہندوستان کی مدد کے بغیر بھی وہ تمام ہندوستان کے لئے سوراج حاصل کریں گے۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اس سوراج کو قائم رکھنا چاہئے۔ جب میں نے پیرس سوئٹزرلینڈ اور روم میں ترکوں سے ملاقات کی تو وہ تعجب سے کہتے تھے کہ وہ ملک جس نے اتنی کثیر التعداد فوج ان کے خلاف لڑنے کو بھیجی تھی وہی ملک یہ وفد بھیجتا ہے تاکہ ہماری شکست کے بعد ہمارے لئے اچھے شرائط کی وکالت کرے۔ میں نے ان کا عقیدہ اس بوالعجبی کو واضح کرنے کے بعد حل کر دیا کہ بہت سے مسلمان سپاہی جو کہ نہ تو ترکی تلوار سے ڈرتے تھے نہ جرمن توپ سے خائف تھے اور موت کے گھر میں جن کو خندقیں کہتے ہیں مہینے گزار سکتے تھے لیکن

وہ پولیس کے آدمی کے۔۔۔۔۔۔ حوالاتوں اور رفید خانوں کی کوٹھریوں سے خائف تھے میرے ترکی دوستوں نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے تو مجھکو چاہیے سب سے پہلے جہاز پر ہندوستان واپس جاؤں اور ان کی غلامی دور کرنے کی بجائے مجھکو چاہیے کہ اپنے ہموطنوں کی غلامی کی زنجیروں کو توڑوں۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ سرزمین ترکی اور آبناؤں پر ہم انگریزوں کو شکست دیدیں گے لیکن ہم تمہارے ہندوستان کے ہجوم کو کسی طرح نہیں روک سکیں گے جنھوں نے فلسطین اور عراق عرب میں ہمکو پیس ڈالا۔ جب تم آزاد ہو جاؤ گے تو خلیفہ کے خلاف کوئی مسلمان سپاہی جنگ کی غرض سے نہ آسکے گا اور اس طریقہ سے ترکی اور اسلام دونوں محفوظ رہ سکیں گے یہ تمہارا ذاتی فرض ہے اور نیز ہماری خاطر تمہاری طرف یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ تم پہلے اپنے ملک کی آزادی حاصل کرو۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "تم اپنے ہندو اور سکھ اہل وطن یہ نہ خیال کرنے دو کہ ان پر صرف انہیں کے فرائض عاید ہوتے ہیں اور ہماری طرف سے کوئی فرض نہیں عاید ہوتا۔ یہ اُن کی غلامی برقرار رکھنے کی خاطر ہے کہ انگریزوں نے ہمکو اتنی وزنی زنجیروں سے جکڑ بند کر لیا ہے۔ دوستو! مجھکو یہ سُن کر بہت مسرت ہوتی ہے کہ میرے ہندو رفقائے کار مشرقی ممالک سے تعلقات قائم کرنے کا خیال کر رہے ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات ہمالیہ کی دیواروں کے پرے پہونچ چکے ہیں اور ارد گرد کے سمندروں کو طے کر چکے ہیں۔ میرے اہل وطن نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ ایشیائی اقوام کی آزادی خود ان کی آزادی کی معاون ہے اور اس لئے "اتحاد مشرق" کے باضابطہ نظام کا خیال کر رہے ہیں۔ اس باب میں پہلا قدم مہاتما گاندھی جبکہ ہماری طرف سے گورنمنٹ کے ساتھ موالات کی بھی حالت رہی کونسی توقعات ہماری حفاظت کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ میں جواب کا منتظر ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ مجھکو جواب شاید نہ ملے۔

اس اثنا میں مسلمانوں کے مقامات مقدس غیر مسلم حکمبرداریوں کے زیر تسلط ہیں۔

ہر مسلمان جو دن میں پابندی کے ساتھ پانچ مرتبہ نماز پڑھتا ہے کعبہ کی طرف منہ
کر کے پڑھتا ہے۔ میں بیجاپور جیل ہی میں تھا کہ یہ سوال میرے ذہن میں پیدا ہوا اور جس کو
میں نے نظم کر دیا اور اب تک اس کا جواب مجھکو نہیں دیا گیا ؎

اس کا کعبہ جس کی جانب روز پڑھتے تھے نماز
کیا کہیں گے اس سے کیونکر قبضۂ دشمن میں تھا

کانگریس کی تفریق

دوستو! مسئلہ ہندو مسلم اتحاد پر مجھکو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اور اگر اس طویل بحث
کے بعد بھی کسی ہندو یا مسلمان کو باہمی تعاون اور غیر ملکوں کے ساتھ عدم تعاون کو
تسلیم کرنے میں تامل ہو تو میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا اور اپنی شکست کا اقرار
کرتا ہوں۔ یہ بات مسلّم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور
نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے۔ اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں
تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس موقع کو اسی وقت کھو دیا تھا جبکہ محمد بن قاسم
نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا۔
اس وقت تو مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور اب تو ان کی تعداد سات کروڑ سے
بھی زیادہ ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا
موقعہ ہاتھ سے کھو دیا جبکہ وہ کشمیر سے راس کماری اور کراچی سے چٹاگانگ تک حکمران
تھے اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کی نسل فنا کر سکتے تھے فارسی کی کیا خوب
مثل ہے۔

مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خویش بزن

جب کوئی چارہ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چھٹکارا پا سکیں

تو ان کو ایسی صورت نکالنی چاہئے ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کر لی جائے اور مسلمان ہندوؤں کے دماغ سے سوراج اور بیرونی حملہ کی مدافعت کے متعلق تمام شکوک رفع کر دیں اور ہندو مسلمانوں کے دماغ سے وہ تمام شکوک رفع کر دیں۔ جو ۔۔۔۔۔۔ کا اٹھ چکا ہے یعنی جب امرتسر میں انہوں نے اپنے آپ کو معاملہ خلافت میں بالکل جذب کر دیا۔ یہ ایک بڑی تعجب انگیز بات ہوگی کہ جب ہندو تو "اتحاد مشرق" کا نظام قائم کرنے کی فکر میں ہوں اور ہندوستانی مسلمان ان سے معاونت ترک کریں صرف اس بنا پر کہ ایک اخبار کے نامہ نگار نے مسلمانان سہارنپور کی مظلومیت میں سمرنا کے ہولناک واقعات کی حقیقت کو پنہاں دیکھا۔ اس سے زیادہ احمقانہ حرکت اور کیا ہو سکتی ہے اور اگر ترکوں کو ہمارے اس مقابلہ کا علم ہو تو وہ ہرگز ہمارے ممنون احسان نہیں ہونگے۔

میں ان اصحاب سے جو واقعہ سہارنپور کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو ترک موالات سے موالات کی طرف پھر جانے کو معقول وجہ قرار دیتے ہیں چاہے ہندوؤں ہی کا بہت کافی نقصان ہوا ہو۔ ایک سوال دریافت کروں گا۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت انگریزی حکومت موجود نہ تھی جب مسلمان ہر قسم کے شدید مظالم کے شکار ہو رہے تھے۔ کیا اس ضلع میں کسی ہندو یا ترک موالاتی مسلمان کے ماتحت انتظام حکومت تھا؟ اور سب سے آخر یہ کہ محکمہ قضا کا کیا ایک مسلمان حاکم اعلیٰ نہ تھا جو کسی زمانہ میں اپنی قوم کا رہنما خیال کیا جاتا تھا اور اب اس نے اسی قوم سے علحدگی اختیار کر لی ہے اور غیر ملکی حکومت کے ساتھ موالات اس کا شعار ہے۔

یہ تین علحدہ علحدہ سوالات نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سوال ہے۔ یعنی اگر نہ تو خود گورنمنٹ اور نہ وہ مسلمان جو اسکے ساتھ موالات کر رہے ہیں مسلمانان سہارنپور کو مصیبت سے نجات دلا سکے تو آئندہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اپنی موجودہ غلامی کو ایک ایسی غلامی سے

اصل میں میرے ہموطن حاکم ہوں بجائے اس کے کہ ایک غیر میری قسمت کا مالک ہو خوشی
تبدیل کرنے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ اس تبادلے میں کم از کم اپنے پچیس کروڑ ہم مذہبوں
کو قید غلامی سے بچا سکتا ہوں جن کی غلامی یورپ کی لامتناہی شہنشاہیت کی زندگی کی
ضمانت ہے۔ ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ میں جب ایک ہندو نے میرے بزرگ بال گنگادھر تلک مہاراج سے
اس امر کی شکایت کی کہ وہ مسلمانوں کو ضرورت سے زیادہ (حقوق) دیئے جاتے ہیں تو انہوں نے
ایک ہوشیار اور دوربین ماہر سیاست کی طرح جواب دیا۔ "آپ لوگ مسلمانوں کو ضرورت سے
کبھی زیادہ نہیں دے سکتے"۔ آج جبکہ میں یہ شکایت سنتا ہوں کہ ہم مسلم ہندو اتحاد کا راگ گانے
میں اپنی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں حالانکہ ہندو اتحاد پیدا کرنے کی بالکل کوئی خواہش ظاہر نہیں کرتے
تو میں کہتا ہوں "آپ ہندوؤں کے ساتھ اپنے معاملات میں بہت زیادہ کمزوری نہیں دکھا سکتے" یا اگر کہو
کہ صرف بزدل ہی دوسروں کے سامنے حد سے زیادہ کمزوری ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اسقدر غور و خوض کے بعد
بلا کسی صحیح اور مستقل نتیجہ پر پہنچے ہوئے جسکے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے میں اس مسئلہ کو ختم کئے دیتا ہوں۔

کانگریس میں پارٹیاں

گوہاٹی کے اجلاس خاص کا مقصد یہ تھا کہ داخلہ کونسل کے متعلق وہ کوئی فیصلہ کرے لیکن یہ پارٹیوں کا سوال
سب سے بڑا تھا جسکو اس اجلاس میں طے پا جانا چاہئے تھا۔ میں نے اپنے خطبہ کا بہت بڑا حصہ اس (سوال) کیلئے نہ صرف
اسکی اہمیت کی وجہ سے وقف کیا ہے بلکہ اسلئے بھی کہ خوش قسمتی سے دوسرا مسئلہ کونسل اب بحث طلب نہیں رہا۔ دہلی میں میری
درخواست پر کانگریس نے یہ رکاوٹ دور کر دی اور ان لوگوں کو جنہیں کونسلوں میں جانے اور آئندہ انتخابات میں …
[illegible] کے خلاف کوئی مذہبی اعتراضات نہیں تھا اور نہ ایسا کرنا انکے ضمیر کے خلاف تھا اجازت دیدی تھی
کانگریس نے مقاطعہ کونسل کیلئے جسے تین سال قبل اسقدر اعلیٰ کامیابی حاصل کر لی تھی تمام کوشش ملتوی
کر دی تھی۔ انتخابات ہو چکے ہیں اور میرے ناچیز خیال کے مطابق اس بحث کو دوبارہ چھیڑنے میں جسنے ہم کو ایک سال
سے زیادہ عرصہ تک لاحاصل جد و جہد میں مشغول رکھا اور جو ہماری طبائع پر ناقابل برداشت بار ہوا کچھ فائدہ نہیں ہے
میں سرکاری عدالتوں درسگاہوں اور کونسلوں کے مقاطعہ کا زبردست حامی ہوں اور کانگریس نے اس ملک

کو برداشت کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے مثلاً باقاعدہ طور پر سپرد کر کے چھوڑ دیا
یہ واقعہ مجھے ایک دوست کی یاد دلاتا ہے جس نے اچھی خاصی آمدنی کی نوکری چھوڑ دی تھی اور
شمالی ہند کے مسلمان گریجویٹوں کے عام اصول کے خلاف انہوں نے بمبئی میں ایک بزنس
کیا تھا۔ ایک روز جو ملاقات ہوئی کہنے لگے کہ اس نے ایک دن اپنی تجارت میں سو فیصدی کا نفع حاصل کیا اور
اس کام میں تمام دن مصروف رہا۔ میں نے جب زیادہ تفصیلات پوچھیں تو میرے دوست نے
جواب دیا۔ کہ اس نے چند بنڈل جاپانی کاغذ کے (ہینڈلوں) فروخت کئے تھے اور سو
فیصدی منافع مشکل سے اس کے دفتر کے ایک دن کی تنخواہ کے برابر ہو گا۔ سن ۱۹۲۱ء میں [illegible]
کی تکلیف دہ کوشش سے امپیریل کونسل نے ایک تجویز منظور کی جس میں ہندوستان کو سلطنت کے باقی
ساتھیوں کے مساوی حیثیت کے اصول کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ لیکن اس
کانفرنس کی کارروائی میں جنرل اسمٹس نے نہایت ہوشیاری سے ہیملٹ کے تماشہ میں شہزادہ
ڈنمارک کا پارٹ اڑا دیا۔ اور باوجود اس کے ہندوستان کو ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے
سو فیصدی منافع پر خوشیاں منائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منافع اب تک حاصل نہ ہوا
کامل دو برس کے بعد شہنشاہی دفتر تجارت کی ہتھیلی پر دوبارہ جنگ لڑنی پڑی اصل سودے
کے متعلق شبہات پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ رقم کی ادائیگی ضروری ہے یا صرف منافع
ہے۔ اور یہاں پر چالاک لوئر جنرل نے یہ چاہا کہ یہ معاملہ ہی ختم ہو جائے لیکن
ہندوستان کے سفری ایجنٹوں کی خوش قسمتی نے پھر ساتھ دیا۔ حالانکہ ان میں
باہم کافی اختلاف تھا۔ اور ان میں سے ایک نے کولمبس کی طرح ایک عجیب انکشاف
ہی کیا۔ جس نے یہ معلوم کر لیا کہ لوئر جنرل بھی ہندوستان کا دوست ہے گو وہ
اس صفت کو نہایت ہوشیاری سے چھپائے ہوئے ہے۔
ہم نے سو فیصدی نفع پھر حاصل کیا اور گرانقدر کمیشن بھی ہر شریک کو دوسرے فریق
یا دوکان سے ملنے کی توقع ہو گئی۔ اور براہ راست معاملہ کرنے سے پہلے بھی تھا

چل جائیگا۔ کہ ادائیگی رقوم کی کیا توقع ہے۔ اس کو تو بہرحال منافع خالص سمجھا جائے
ڈاکٹر سپرو کے کہ ان شستوں کو (جن میں سے بلاشبہ کئی انگلستان کے بیکاروں میں سے
بھرتی کئے جائیں گے) جاں نثاران و ارباب دولت کے حصہ داروں کے ساتھ براہ راست
معاملت کرنیکا امتیاز حاصل ہوگا۔ اس غرض سے کہ مجموعہ نتائج حاصل شدہ کے کم
بیشی کا اندازہ کیا جا سکے میں اخبار ٹائمس کے اس مضمون کے آخری حصے سے
جس کا عنوان "ہندوستان اور سلطنت مشترکہ" تھا وہ نتائج نقل کرتا ہوں جن کا استخراج
میں ٹائمس نے کمال محنت صرف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "ہمدردی اور خیرسگالی کا اظہار
جو حکومت برطانیہ اور مستعمرات ماوراء البحر کے نمائندوں کی طرف کیا گیا ہے ہندوستان نے
سلطنت مشترکہ کی استحکام میں جو حصہ لیا ہے اس کی بھی قدردانی۔ یہ امور ہندوستان کے
لئے اس قدر اہم ہیں جس قدر اس کے اس حق کی عملی تسلیم کہ وہ اپنے متعلق دوسرے شرکاء
سے معاملت کر سکتا ہے۔ لاریب کہ ڈاکٹر سپرو اور ان کے شاہی رفیق نے ہندوستان کی
اس حق کے عملی تسلیم کرالئے جانے میں کامیابی حاصل کی ہے کہ ہند اپنے متعلق دوسرے شرکائے سلطنت
مشترکہ سے معاملات کر سکتا ہے۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس معاملت کی تکمیل کب ہو جائیگی اور
رقم کب تک ملیگی اور اسکی مقدار کیا ہوگی؟ آئندہ کانفرنس بلاکسی وقفہ پے در پے اور
یکے بعد دیگرے نہایت باقاعدگی کے ساتھ ہوتی رہیں گی اور ہر کانفرنس کے انعقاد کے بعد
ہندوستان کی کامیابی کا اعلان و اشتہار نہایت شور و شغب سے ہوتا رہیگا۔ مگر انسان کی ضعیف
انسانیت کی طرف سے۔ یہ امید کرنا بہت زیادہ ہے۔ کہ وہ تو صرف تحمل کیساتھ انتظار کرتا رہے
اور اس عرصہ میں شہنشاہی عمل تجربہ شروع ہو۔ سب سے پہلے ذرات مجتمع ہوں اور ان میں
مرور زمانہ سے کیفیت اتحاد کی پیدا ہو۔ اس کے بعد یہ عمل دور حجری کے تمام طبقات
طے کرتا ہوا۔ عہد جدیدیہ ثانیہ و ثالثہ اور اسکے عہد و عہد مابعد الجدیدیہ کرتا ہوا
دور حیوانیہ تک پہنچتا ہو۔ کوئی ابتدائی بالغ رشتہ ایسا تحمل نہ ہوگا جو ہماری سیاسی ترقی کی راہ

مناسب نہ ہوگا بلکہ اب بے پرواہ حملہ جارحانہ کے بجائے مدافعت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور جو
لوگ ہمارے سپہ سالار (گاندھی جی) کو پوری طرح سمجھانے سے قاصر رہے انکی نظر میں یہ تغیر
طریق جنگ ہتھیار رکھ دینے کے مرادف معلوم ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کراچی جیل سے بیجاپور
جیل منتقل کئے جاتے وقت خود مہاتما جی کو لکھ دیا تھا کہ اس تغیر طریق کی بنیاد انکی کمزوری پر
نہیں بلکہ انکی قوت پر تھی۔ اور اگر وہ چند ہفتے اور آزاد رہنے پاتے تو انہوں نے یقینا صورت حال کی
کایا پلٹ کر دی ہوتی۔ لیکن عین اسوقت جبکہ لوگ فیصلہ بردولی کے سمجھنے سے متذبذب و منفعل
ہو رہے تھے انہیں گرفتار کر کے قید کر دیا اور گو انکی جلا وطنی کا ماتم کرنے والے سیکڑوں نہیں ہزاروں
اور ہزاروں نہیں لاکھوں اور لاکھوں نہیں کروڑوں نفوس تھے لیکن ایک متنفس بھی ایسی
اہلیت کا نہ نکلا جو بردولی پروگرام میں تازہ روح پھونک دیتا اور گورنمنٹ نے مہاتما جی کو
ایک معمولی مجرم کی طرح برباد کر کے ہمیں جو اقدام عمل کا موقع دیدیا تھا اس موقع سے
پورا فائدہ اٹھاتا۔ میرے پاس کافی معلومات ہیں جسکی بنا پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مہاتما جی
ان حضرات کے باوساطت مشورہ سے یہ کہاں تک حق بجانب تھے انکی خدمت میں دو دن رہے ہو
یہ کہتے تھے کہ واقعہ چوری چورہ کے بعد سول نامتابعت شروع کرنا تشدد کا آغاز
کرنا تھا لیکن میری رائے میں مہاتما جی کی قید پر فوراً سول نامتابعت بغیر خطرہ تشدد کی شروع
کی جا سکتی تھی اور میں اس موقع پر اپنے سردار کی عدول حکمی یقینا گورنمنٹ سے اس ہتیار سے
لڑتا جو اس نے ہمارے ہاتھ میں مہاتما جی کی اسیری سے دیدیا تھا۔ یہ قول بھائی شوکت کا ہے
جب طبیب بیمار ہو جاتا ہے تو خود اپنا علاج نہیں کرتا اور مہاتما جی زندہ درگور کر دیئے گئے
بعد ہمارے لئے اس قدر بس تھا کہ ہم انکے عقیدہ تشدد پر تو پورے راسخ رہتے باقی سول
نامتابعت کے التوا کے متعلق انکی وصیت پر ہرگز عمل نہ کرتے۔ چونکہ یہ سہو اب ماضی کے
وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہو تو اس وقت کے متعلق ہماری کچھ رائے کیوں نہ ہو اگر
ابتدا و کفایت معمولی طور پر سہی لیکن کسی سول نافرمانی کے دور نے جس میں کہ اسی وقت حرکت

اور جس نے ہمارے بہترین کام کرنے والوں کی توجہ کو نشستوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور ہمارے
نوجوانوں میں سے بہت سے جوشیلے لوگوں کو اس حصہ کے طرف مائل کر دیا جو کونسلوں میں
جایا جاتے تھے اب تو اس پر غور کرنا ہی بیکار ہے کہ اگر ہمارے نوجوان برابر مشغول رہتے اور
تعمیری پروگرام کو ترقی دیجاتی تو اس جماعت کے حالات پر کیا اثر ہوتا اس پر غور کرنا
صرف اسی حیثیت سے مفید ہے کہ اس سے آیندہ کے نظام عمل کے متعلق رائے قائم کیجا سکتی ہے
بخلاف اس کے بعض میرے سوراجی دوست بھی چاہتے ہیں کہ میں اس کا اندازہ کروں
اگر گیا کے موقع پر دہلی والی تجویز منظور کر لی جاتی تو انتخابات میں اونکی کامیابی آج کی
نسبت کسقدر زیادہ ہو جاتی میں اس کا جواب ایک دوسری طریقہ پر غور کرنے سے
دیسکتا ہوں جسکی بنیاد سراسر خود پسندی پر ہے یعنی اگر مجھے گیا میں اون کیساتھ ایک
ہونیکا موقع ملتا اور میں اون کو اس قسم کے طرز عمل سے علیحدہ رکھنے کی ترغیب میں
کامیاب ہو جاتا تو سوراج پارٹی کا وجود ہی کہاں ہوتا لیکن یہ تمام باتیں بے سود ہیں
سوراج پارٹی موجود ہے اور اگرچہ اس میں بہت سے مختلف المزاج عنصر موجود ہیں تاہم
اس میں شبہ نہیں کہ با اعتبار تعداد وہ اونچی طاقتور ہے اور اپنے لیڈروں کے اعتبار سے
تو ہمیشہ طاقتور رہی لیکن تمام پارٹیوں کی انفرادی میں شرکت انتخابات کی اجازت محض
انکی اخلاقی اور بدنی ذمہ داری پر دیگئی تھی یہ جماعت انتخابات میں شریک ہوئی اور
مخالف قوتوں کا لحاظ کرتے ہوئی نیز اس مختصر زمانہ کو دیکھتے ہوئی جسمیں اسنے اپنی
طاقت کو منظم کیا کافی کامیابی ہوئی یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ کس لئے بہترین ممبر اس
بنا پر انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے کہ ان کی مدت ہمارے
قید زیادہ طویل تھی بہر حقیقت انتخابات تھی زیادہ اچھی نہ تھی اصلی کثرت بہت تین سال قبل کسی
شخص کو بھی سوائے بڑی جماعت کے ان ممبروں کیطرف توجہ نہ تھی اور اس آخر زمانہ تک بھی جن
لوگوں نے بالاخر سوراج پارٹی کی شرکت منظور کی وہ بھی قطعی طور پر امیدوار کونسل

کونسل ہو ناطلی نہیں کرچکی تھی یا شرکت انتخابات کا ارادہ نہیں رکھتے تھے یہ سچ ہے کہ بیشتر رائیں کانگریس کو دیگئی ہیں نہ کہ اون لوگوں کو جنہیں اون کی طلب تھی لیکن کیا ضرورت ہے کہ مہاتما گاندھی سے بھی اس کا تذکرہ کیا جاوے میرے بعض دوستوں کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ بغیر کسی بات کے مہاتما جی کا نام لیا اون سے مجھے ایسے دلی ہمدردی ہے اور میں یہ کہے بغیر رہ نہیں سکتا کہ اس سیاسی طرز عمل میں مجھے ان سے پورا اتفاق ہے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جن لوگوں کو رائیں دیگئی ہیں وہ بہ نسبت اپنے مخالفین کے مہاتما گاندھی سے زیادہ قریب ہیں الیکشن سے بعض لوگ بڑی خودرائی لیتا تھا اس بات کا مشغلہ اور سمجھے کہ دنیا کے معاملات سے ناواقف کار مہاتما نے اپنی طاقت کا تمام دارومدار چرخہ جیسی بے ماحیر کو قرار دے لیا ہے جیسا کہ ترقی یافتہ زمانہ میں ہماری عقل بھی ترک کر چکی ہیں انکے خیال میں مہاتما گاندھی ایک غلط کار اور فتنہ انگیز انسان تھا جسے ایک ایسے ڈیرائی کے خلاف جو گذشتہ جنگ میں اتنا نام پیدا کر چکا ہو غیر معمولی چالاکی اور ہوشیاری کی ضرورت تھی لیکن دوران انتخابات میں بہت سے لوگوں کو تجربہ ہو گیا ہوگا کہ ہمیں ابھی تک مہاتما جی کو اوسی عقیدت سے دیکھنا پڑے گا اور وہ کیسی ہی چالاک اور معاملہ فہم کیوں نہ ہوں خود کونسلوں کے اندر بھی وہ اپنی ہوری لیت طاقت کے لیے انہی لوگوں کی حمایت کے ممنون ہوں گے جو مہاتما کو اوسی محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انہیں اوتار خلق اور شریک کار سمجھتے ہوئے ان کیساتھ شامل ہو گئے تھے یہ تجربہ اون کے لیے ایک قیمتی شے ہے اور وہ معقولیت فہم اور عالی خیالی جن کا ہماری امیدوں کے مطابق اونہوں نے اپنی تحمالی کے وقت ثبوت دیا اونہیں کانگریس کا ایک بیش بہا عنصر ثابت کرتی ہیں

یہ صحیح ہے کہ جتنی امیدیں اپنے پروگرام سے انہیں ہیں اتنی ہمیں نہیں ہیں پھر بھی
ہم انہیں پوری آزادی دیتے ہیں کہ اپنے پروگرام پر عمل کریں۔ ہم انکی کامیابی
کی دعا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی اسکے عوام کے دل سے اس خیال کا کہ تعمیری پروگرام نہیں
بلکہ کونسلیں ہی سوراج دلائینگی جہاں ضرورت ہوئی ازالہ کرتے رہینگے
ظاہر ہے کہ تعمیری پروگرام پر عمل درآمد کیلئے انکے پاس اتنا وقت نہ ہوگا جتنا کہ
ہم میں سے ان لوگوں کے پاس ہے جنہیں کونسل کے کام کرنے نہیں ہونگے
مگر میں نے اس امر کے متعلق اپنا اطمینان کر لیا ہے کہ انکے ذمہ دار لیڈر اپنی طاقت
اور امکان کی حد تک ہمیں مدد دینے کا قصد کرتے ہیں اور اس طرح سے وہ
کونسل میں بیٹھکر ہماری امانت ثابت ہونگے۔ اگر آگے چلکر کسی موقع پر انہیں
کونسلیں چھوڑنی پڑیں تو انہیں کام کی وجہ سے جو انکی نسبت
کونسل کے زمانہ میں باہر یعنی انکے حلقوں میں اس وقت تک
ہو چکا ہوگا یہ امر یقینی ہو جائیگا کہ کوئی شخص ایسا نہیں کہ امید کی
انکی کونسل سے روانگی کے وقت یہ نہ کہہ سکیگا کہ سب
رخصت ہوئے تو کوئی کیا بھی نہ ہو سکا۔ اور اگر ان کی کوشش
و محنت کی بدولت سوراج مل گیا تو ابھی تو میں لکھتا ہوں کہ مجھے
اسے قبول کرنے میں مطلق انکار نہ ہوگا۔ اگر کانگریس کی عظمت
بقا کے لئے ہندو مسلم اتفاق کی ضرورت دہلی میں تھی تو آج
اسکی عظمت کو بڑھانے اور تعمیری پروگرام میں
ہماری امداد کرنے کیلئے صلح و اتفاق کی
اس سے زیادہ ضرورت ہے

تعمیری پروگرام

اس پروگرام ہی کے خاطر میں نے اُس مصالحت میں حصہ لیا جسکی تکمیل دہلی میں ہوئی تھی
کیونکہ صوبوں کے بڑے حصّے نے سارا سال آپس کے تو تو میں میں کے نذر کردیا اور اگر مہاتما گاندھی
کی رہائی ترحم خسروانہ کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ہماری کوششوں کے ذریعہ سے ہونی چاہیئے تو لازم
ہے کہ وہ کام پھر شروع کیا جائے جس پر مہاتما جی کو بجا طور پر پورا بھروسہ اور اعتقاد ہے۔ میں صحیح
اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ مہاتما جی کے چلے جانے سے کس حد تک ابتری و بدنظمی واقع ہوئی
لیکن ابتک جو کچھ کام ہوا ہے اُس کی تفصیل کے متعلق میرے سوالات کے جو جوابات
وصول ہوئے ہیں وہ اس امر کا کافی ثبوت ہیں کہ کسی نہ کسی وجہ سے اب تک کچھ کام نہیں ہوا
ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے صوبے بھی ہیں۔ مثلاً گجرات جہاں کا کام میرے دوست سرکیت ولا
بھائی پٹیل کے لیئے اور کام کرنے والوں کے اُس گروہ کیجسے مہاتما گاندھی نے اُن کے ماتحتی
میں رکھا تھا قابل تعریف ہے۔ بہت کم صوبے ہیں جو تعلیمی کام کا ایسا اچھا نمونہ پیش کریں اور
اگر گجرات نہ ہوتا تو دوسرے صوبوں میں جو کھادی تیار ہوئی تھی وہ بہت عرصہ تک ویسی ہی
پڑی رہتی اور اُسکے بکنے کی نوبت نہ آتی۔ مگر مہاتما جی کا زمانہ فخریہ نہ تھا کہ اُنہوں نے گجرات
کی شکل بدل دی۔ بلکہ یہ تھا کہ اُنہوں نے کل ہندوستان کی شکل بدل دی۔ کسی صوبہ کی حالت
اب وہ نہیں ہے جو اُن کے اس کام پر اُٹھنے کے وقت تھی۔ گجرات اُن لوگوں کو حیرت میں ڈالنے
کی تیاری کر رہا ہے۔ جن کا خیال ہے کہ اگر مہاتما جی کے بلند معیار کو پیش نظر رکھا جائے تو ملک
کا کوئی حصہ سول نافرمانی کے لیئے تیار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خربوزے کو دیکھکر خربوزے نے
رنگ نہ پکڑا اور کسی نے گجرات کی تقلید نہ کی۔ اس لیئے ہمیں گجرات کی تیاری ہی کو کافی نہ سمجھنا
چاہیئے۔ کل بیڑے کی رفتار وہی ہوگی جو اُسکی سب سے سُست کشتی کی رفتار ہوگی افسوس کہ ہمارے
بیڑے میں سُست رفتار کشتیاں بہت ہیں اگرچہ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک سب کے سب سمندر

ہیں چلنے کے لائق ہیں۔ میں اپنے اُن دوستوں کے سامنے جو پروگرام کی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔ اس سے زیادہ معقول دلائل نہیں پیش کر سکتا جو اجلاس دہلی کے "لیڈنگ انڈیا" کے ایک نامہ نگار نے لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دلائل و حجت کی بھی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتی۔ بعض نتائج عمل کی قسم سے ہیں اور وہ ہمیشہ معقولیت کی حدود سے متجاوز ہوتے ہیں۔ جہاں دلائل ترغیب نہیں دے سکتے وہاں تجربہ سے کام لیا جاتا ہے۔ ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم اسی منزل پر آگئے ہیں۔ ایک سال کی مسلسل کوششوں اور بیکاری نے لوگوں کو کثرت حجتی اور خود پسندی میں اور پختہ کر دیا۔ آج سب کے لیئے امتحان کا وقت ہے سوراجیوں کے لیئے بھی، مرکزیت کے دلدادوں کے لیئے بھی، محمد علی کے لیئے بھی لیکن ہم تبدیلی نہ چاہنے والوں کے لیئے بھی۔ ہم کو واقعات کے زبردست نظام کا تابع ہونا پڑے گا۔ کلکتہ کانگریس کے زمانہ سے مہاتماجی کو ہر جگہ پوری کامیابی ہوئی اور ہم جو مہاتماجی کے متبع کہلاتے ہیں۔ ہمیشہ اسغطرہ میں رہے کہیں نامناسب غور و فکر اور بے سعی کوششوں میں نہ پھنس جائیں شکست ہونا ہر شخص کے لیئے مناسب ہے۔ اگر اس مقولہ میں کچھ صداقت ہے تو شکست کی تکلیف ہی ہم کو اپنی حالت پر غور کرنے اور دوبارہ قوت حاصل کرنے پر آمادہ کرے گی۔

اگر بخلاف اسکے مہاتماجی کی تعلیم ہماری کاہلی کا ذریعہ اور عجلت پیدا ہونے والے واقعات کے نتائج پر غور نہ کرنے کا سبب بن جائے تو ہم اپنے سردار کے صحیح پیرو کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔ ہم اس قابل نہیں کہ اُن کے اُس پیغام کو جو اُنہوں نے تمام دُنیا کو دیا ہے اُسکے امانت دار قرار پائیں۔ بے شک، "واقعیت" ہی وہ سچی اور یقینی کسوٹی ہے جس پر سوراج پارٹی والے، مخالفین کونسل، آپ میں، اور ہم سب کو اسی واقعیت کی کسوٹی پر جانچا جائیگا۔ دوستو، یہ ہی باعث ہے کہ میں آپ کو کام کرنے کی تبلیغ کر رہا ہوں لیکن اس وعظ پر عمل کرنا اسقدر آسان نہیں جسقدر اس کی زبانی تبلیغ ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں نکتہ چینوں کی تعداد کام کرنے والوں سے زیادہ ہے لیکن کسی کام کا خوبی سے انجام پانا

ایسی ولولہ انگیز مسرت ہے جسکا مقابلہ نکتہ چینی کے بے مزہ لطف سے ممکن نہیں ہے جیساکہ سنسکرت شاعر نے شاعری کی تخیلی حیثیت کے متعلق لکھا ہے کہ بانجھ عورت کو کیا خبر کہ ولادت کی تکالیف و آرام کیا ہوتے ہیں اور نو زائیدہ بچہ کے دیکھنے اور چھونے سے جو ناقابل بیان مسرت ماں کو ہوتی ہے اسکا تو وہ اندازہ ہی نہیں کرسکتی۔

بلاشبہ آپ یہ دریافت کرینگے کہ ہمارا کام کیا ہونا چاہئیے اور میرا جواب کامل غور و خوض کے باوجود یہ ہی ہوگا کہ ہمکو بردولی پروگرام کے سوائے چارہ نہیں جسکی کافی مذمت ہو چکی ہے۔ اگر ہم اپنے کام کے ہر جز کو اپنے راستہ کے دشواریوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے چھوڑتے چلے جائیں تو ہم کبھی کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ بہت سے آدمی آپ سے کہتے ہیں کہ ترک موالات ناکامیاب رہا حالانکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ باہم یا دونوں اسقدر نہ اُبھرے کہ اپنے نصب العین تک پہنچ سکتے۔ لیکن باوجود اسکے جیساکہ میں ابھی کہہ چکا ہوں راستہ آسان ہے۔ اسوقت جبکہ تم اپنی وکالت دوبارہ شروع کرنے کا قصد کرو، یا اپنا مقدمہ عدالت میں لیجاؤ، یا اپنے لڑکے کو کسی بہتر اسکول میں بھیجنے کا خیال کرو تو اتنا یاد کرلو کہ اونی سے ادنیٰ سپاہی کسقدر قربانی کے لیئے آمادہ رہتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو کچھ بھی پنا گوارا نہیں کرسکتے اون کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ اگرچہ پھر بھی یہ نہیں ہے کہ وہ محب وطن نہو، یا حددرجہ غورو خوض ہو۔ لیکن صرف کاہل اور سست قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہرحال اسکی کاہلی دفع کرنی پڑیگی۔

اور اسی کا سب سے بہتر اور کامیاب ذریعہ ہماری مستورات ہیں، بہت ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص مہاتماجی کے عہد یا یہ تخیل سے کنارہ کشی اختیار کرلے یا اسمیں پورا نہ اُترے لیکن ہماری مستورات بہرحال اپنے ملک، اپنے سردار اور اپنی ذات سے دغا نہ کرینگی۔

سیٹھ جمنالال بزاز اور رگنی لال اور چگن لال بھائی گاندھی جیسے ماہرین کو ضروری امداد و نگہداشت کے لیئے چھوڑتے ہوئے چند کلرکوں اور بہی کھاتہ رکھنے والوں کے علاوہ ہمیں اپنے ہر صوبے اور ہر ضلع میں کھادی کے شعبہ کو اپنی بہنوں کے ذمہ کردینا چاہیئے۔

آدمی جیل خانوں میں جایا کریں یا وہاں سے واپس آیا کریں ہماری عورتوں کو ہر حالت میں کھادی کی تیاری میں مصروف رہنا چاہیئے۔ اسیطرح دوسرے شعبوں کی تنظیم بھی ضروری ہے لیکن کھادی کے بعد اہم ترین شعبہ قومی تعلیم کا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ سنہ ۲۱ء میں میں نے بیزوادہ میں ایجوکیشنل بورڈ کے قیام پر کیوں زور نہیں دیا۔ بہرکیف اب ایسے مرکزی اور صوبے وار بورڈ فوراً قائم ہو جانا چاہیئے اور ہمیں اپنے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا سنجیدگی کے ساتھ انتظام کرنا چاہیئے۔ میں ضروری نہیں سمجھتا کہ ہر شعبہ کا ایک ایک کرکے آپکے سامنے ذکر کروں۔ اس لیئے کہ بردوالی کے پروگرام کو اگرچہ ہم کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کرسکتے لیکن ۱۹۲۱ء کی تجاویز پر عملدرآمد ہو جانا ضروری ہے چنانچہ ان سب باتوں پر عمل کرتے ہوئے ہمیں خاص خاص اوقات میں خاص شعبوں پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینا ہوگی۔

لیکن اگر ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے تو ان تمام شعبوں کے متعلق گفتگو کرنا بے فائدہ ہے اور یہی ایک شعبہ ہے جس پر سال بھر تک ہمیں توجہ دینا پڑتی ہے جب ملک جانتا ہے کہ یہ دادہ جیل کی کنجی صرف مہاتما کے پروگرام پر عمل کرنے ہی سے میسر آسکتی ہے۔ اور بغیر روپیے کے کوئی کام نہیں چلتا تو کوئی وجہ نہیں کہ روپیہ کے معاملہ میں ہماری کوشش رائگاں جائے البتہ ایسے بڑے بڑے عطیات کے علاوہ جنکے صرف خاص موقعوں پر درخواست کی جاتی ہے۔ ہمیں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ اگرچہ وہ کسیقدر قلیل ہی کیوں نہ ہو ضرور تلاش کرنا چاہیئے لیکن اسکے ساتھ ہی ہمیں غربا میں اتنی استطاعت پیدا کرنا ہے کہ وہ ماہواری چندوں کے ذریعے سے ہمارے قومی سرمایہ میں حصہ لے سکیں، بعض موقعوں پر ہمیں لوگوں کی سہولت کے مطابق اتنی امداد سے فائدہ اُٹھانا ہے اس لیئے کہ اور ہم کو مہاتما جی کے پروگرام پر عمل کرنے کے لیئے جسقدر روپیہ کی ضرورت ہے اسیقدر ایک زبردست نظام کارکی بھی حاجت ہے جسکے ذریعہ سے روپیہ حاصل ہو۔ اور یہ تنظیم ایسی نہ ہونی چاہیئے کہ بغیر تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے ہو۔ یہ قابل تعجب ہے کہ ہم نے اب تک اپنے

وسیع رقبہ میں جو تقریباً ایک چھوٹا برِ اعظم ہے اپنا قومی کام صرف اتنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعے سے کیسے کر لیا جو بہ اعتبار تعداد ایک ضلع کے دفتر کے لائق بھی نہیں۔ ہم کو اسوقت ایک عجیب صورت حال سے معاملہ پڑا ہے۔ ایک طرف تو ہم کو لائق پُر جوش اور قطعی قابل اعتماد کام کرنے والے لوگوں کی ضرورت ہے جو اسوقت ہمارے پاس موجود ہی نہیں ہیں۔ دوسر طرف ہمارے پاس بیکار لوگوں کی پوری فوج موجود ہے۔ بعض وکالت پیشہ لوگ جو ترک موالات کے پروگرام کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہیں اور یہ لوگ وہ نہیں ہیں جن کو کام میں نہ لگایا جا سکے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس دُہری دشواری کا علاج نہ کریں جو صاف ظاہر ہے اور جسکے سوا کوئی دوسری صورت نہیں۔ ہم خواہ صرف گذر اوقات کے لایق ایسا معاوضہ دیں جو کھدّر کے دور دورہ کے مطابق ہو۔ لیکن ان زبردست کام کرنے والوں کو جنہوں نے قوم کے لیئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں۔ یہ گزارہ دینا پڑے گا یا درکھئے کہ جس کام میں شیدائیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہی دوسری نسل میں جاکر دغابازوں کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور ہر حالت میں ہر شیدائی کو دُنیا سے رخصت ہونے سے قبل کھانے اور پہننے کو ملنا ضروری ہے۔ ہندوستان آج یہ تماشہ دیکھ رہا ہے۔ کہ ہمارے حریص بدیسی ملازم آلور ٹوئسٹ کی طرح اور زیادہ تنخواہوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اسوقت بھی انہیں اس سے بہت زیادہ ملتا ہے۔ جتنا کہ حریص سے حریص پُر غرور کو ہوس ہو سکتی ہے۔ ہندوستانی سول سروِنٹ جو اگرچہ تھا ذہنی ہندوستانی یا سول یا سروِنٹ (خدمتگزار) کہلایا جا سکتا ہے اسقدر تنخواہ پاتا ہے کہ دُنیا بھر میں کہیں کسی سروِنٹ کو جسکی ایسی ہی حیثیت ہو اس قدر تنخواہ نہیں ملتی ہے۔

خود وہی تو دوسرے ملکوں کو تقلید کے لیئے اپنی مثال قایم کرتا ہے اور ایک مفلس ترین ملک کا خون چوسے جاتا ہے اور ابھی ترقی پا کر پھر ترقی کے لیئے واویلا کرتا ہے۔ اور

باوجود اسکے خود وہی اُن ہندوستانیوں پر خیانت اور خورد برد کا الزام لگاتا ہے جو خدمات
قومی میں مصروف ہیں۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ جسوقت اُس کے کان میں بھنک پڑجائے
کہ کانگریس میں یہ طے ہوا ہے کہ قومی کام کرنے والوں کو کچھ معاوضہ خدمات دیا جائیگا تو چاہے
وہ رقم معاوضہ اتنی حقیر ہو جتنی ادنی سے ادنی مزدور کو دیجاتی ہے پھر بھی اسے سُنتے ہی
وہ اور اُسکے معاونین اخباروں میں ہندوستان کے ان سچے خادموں کو بدنام کرنے شروع کر دینگے
یہ تو ہونا ہی ہے کہ جن بیچاروں کو سیکڑے ہی ملیں گے اُن پر وہ جنہیں ہزاروں مل رہے
ہیں اور جو ہندوستان کے خدمت اس بُری طرح کر رہے ہیں حملہ کرنے سے باز نہ آئینگے
مگر میرے رائے میں یہ کانگریس کے لئے ایک اشد ضروری کام ہے اور مجھے اُمید ہے کہ آپ
حضرات ایک ایسے قابل اور کارگزار محکمے کے ترتیب کا اہتمام کرینگے جو کانگریس کا کام لگاتار
سال بھر کرتا رہے۔ ایک باقاعدہ قومی سکرٹریٹ اگر ممکن ہو تو ایسے مقامات میں جیسی دہلی
ہے قایم کی جائے۔ علی ہذا القیاس دوسرے صوبوں میں دفاتر سکرٹریٹ اور اضلاع میں
دفاتر اضلاع قائم کئے جائیں۔ سکرٹریٹ کے دفتر میں کام کو اتنے مختلف صیغوں میں
باقاعدہ تقسیم کر دیا جائے جتنوں کی ضرورت ہو۔ جماعت عاملہ[1] (ورکنگ کمیٹی) کے
ارکان وہ حضرات ہوں جو وسطی مقامات پر یا جہاں موقع کے لحاظ سے ضرورت ہو اکثر
جلسوں میں شریک ہو سکیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس بات پر ہماری نظر رہی کہ سب دفاتر میں
ایسا عمل کام ہوتا ہے جسکی جانچ پڑتال اور نیز تخمینہ ہو سکے اور ابتدائی مہینے کے مصارف
کے بعد۔ خرچ کسی طرح آمدنی سے بڑھنے نہ پائے۔ جہانتک مجھے معلوم ہے انگلستان کے
سالویشن آرمی جب اپنے کسی کام کرنے والے کو نئے مقام پر بھیجتی ہے تو ایک ہفتے
کے لئے کھانے اور ٹھہرنے کا خرچ اسے پیشگی دیدیتی ہے۔ اور دوسرے ہفتے میں وہ اسقدر
پیدا کر لیتے ہیں کہ اپنا صرف برداشت کر سکیں۔ اسکے بعد اُنہیں اتنا پیدا کرنا ہوتا ہے کہ صدر
محکمے کو باقاعدہ چندہ بھیجتے رہیں۔ ہمارے جو کام کرنے والے کانگریس کے ممبر بنانے لئے

دورہ کرتے رہیں اُن کے لیئے ہمیں اسی طریقے پر کام کرنا ہوگا۔ ایک مرتبہ جب کام چل نکلے تو مجھے یقین کامل ہے کہ ملک پھر بیدار ہو جائیگا اور ۱۹۳۴ء میں ہم ۱۹۲۱ء سے بھی بڑھ جائینگے یاد رکھو آج اور ۱۹۲۱ء میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ یہ سچ ہے کہ مہاتما گاندھی جی اسوقت آزاد تھے اور کام کی تنظیم و ترتیب خود کرتے تھے اور آج گو ان کی یاد ہر ہندستانی ہے، اُن کی عدم موجودگی ہی اس کام کے کرنے کے لیئے ہم میں دو چند ہمت و قوت پیدا کردیگی اگر مسیحیت سے صلیب اور اسلام سے واقعہ کربلا کو خارج کردیا جائے تو پھر کیا رہجاتا ہے؟ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہم نے اپنی صلیب سے پورا کام نہیں لیا ہے دوستو، اگر ہمیں اپنے سردار سے کچھ بھی محبت ہے تو آؤ آج اس کام کو جسے اب تک نہیں کیا کرلیں۔ اور اپنی قوم کی مدد سے ملک کو آزاد کرالیں اور اس بڑے باسٹیل کو (یہ مشہور قلعہ تھا۔ جسمیں انقلاب فرانس کے زمانہ میں جمہوری قیدی بند تھے) توڑ ڈالیں جسمیں مہاتما گاندھی اور انکے ہزارہا پیرو قید ہیں۔

ہمارے سامنے آج ہمارے سکھ بھائیوں کی نظیر موجود ہے جنکی دیوانہ پیشقدمی اور عدم تشدد پر مجھے رشک آتا ہے۔ مہاراجہ نابھہ تخت سے معزول کردئے گئے ہیں اور جن الفاظ میں اس غیر ملکی حکومت کا افسر اعلی ان کی معزولی کا اعلان کرتا ہے وہ نقاب پوش کلمات کفر سے کم نہیں۔

"متحرک انگلی لکھ رہی ہے اور لکھنے کے بعد پھر آگے کو حرکت کرلی ہے تمہارا سارا زہد و تقدس اور تمہاری تمام عقل و فہم نصف سطر بھی مٹا نہیں سکتی اور نہ تمہاری قطرات اشک ایک لفظ کو بھی محو کرسکتے ہیں" باوجود ان کے متعلق تمام باتیں صحیح تسلیم کرلینے کے بھی مہاراجہ صاحب کا کوئی ضامن نہیں۔

اسمیں شبہ نہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے اوصاف کی بناء پر معزول کئے گئے۔ میں خود بھی ایک ہندوستانی ریاست کا رعایا ہوں اور دیگر

ریاستوں کا بھی کافی تجربہ ہے۔ میرے پاس بھی میرے اکثر وہ دوست آیا کرتے تھے۔ جو ہندوستانی ریاستوں میں سیاسی اصطلاحات کے لیے کوشاں تھے۔ لیکن میں انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ ہندوستانی ریاستیں تو ہماری اپنی ہیں اگرچہ آج وہی ریاستیں قوم پرستوں کے لیئے ہندوستان سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوئی ہیں۔

میں کہا کرتا تھا کہ باقی ہندوستان کو آزادی حاصل کر لینے دو پھر دیسی ریاستوں میں بہت جلد ایک نمایاں اور متحیر کن تبدیلی دیکھو گے۔ اس انتظار میں ہمکو چاہیئے کہ اپنے طرز عمل سے ان ریاستوں کے حکمرانوں کو اپنی طرف سے شبہ میں نہ ڈالیں۔ اور ان پر یہ ثابت کرنے کے لیئے ہر موقع سے فائدہ اُٹھائیں کہ ہم لوگ ان کی مشکلات سے غافل نہیں ہیں اور غیر ملکی دفتر شاہی حکومت سے ان پر جو مصائب نازل ہو رہی ہیں۔ ہم ان سے بے اعتنائی نہیں برتتے۔ مجھکو اس کا علم نہیں کہ گورنمنٹ اس قسم کے مواقع ہمکو سب بہم پہونچائے گی۔ لیکن چونکہ ہمکو اسوقت موقعہ مل رہا ہے۔ ہمکو اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ اسطرح یہ مذہبی حقوق کی حفاظت ہوگی۔ مہاراجہ صاحب نابھہ کو تھوڑی تکلیف اسلیئے برداشت کرنا پڑی کیونکہ اُنہوں نے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ ان کی بدیسی دفتر شاہی سے آزادی کی جدوجہد اور اپنے مقدس گردواروں میں اصلاحات کی کوشش میں نہایت بلند آہنگی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس بنا پر راجہ صاحب کے ہم مذہب مصیبت کا شکار بنائے جا رہے ہیں کہ اُنہوں نے دیسی ریاستوں کے حکمراں کی حمایت میں کھڑے ہونے کی کیسے جرأت کی۔ کیونکہ دیسی ریاستوں کو دفتر شاہی حکومت ہمیشہ اپنے ہی ماتحت رکھنا چاہتی ہے جیسا کہ میں بیشتر کہہ چکا ہوں کہ گورنمنٹ کا شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی اور اکالی دَلوں کو غیر قانونی جماعتیں قرار دینا نہ صرف ان جماعتوں یا سکھ قوم پر ناجائز حملہ ہے بلکہ یہ تمام قومیت ہند کے خلاف چیلنج ہے۔ ہر فرقہ کے ساتھ جو اپنے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اسیطرح کا برتاؤ روا رکھا جائیگا۔ اگر ہم نے

پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اب کون جیل نہ جائیگا۔

ہمارا یہ عزم مصمم ہے کہ ہم اپنے سکھ بھائیوں کے معین و مددگار ہیں تاکہ ہم پر صرف
کا الزام نہ عاید ہو۔ لیکن اس سے زیادہ بڑھکر ایک چیز درکار ہے سول نافرمانی
چاہیئے وہ صوبہ دار ہی ہو، جب سے مہاتما کی گرفتاری ہوئی ہے ہمکو کوئی موقع نصیب
لیکن سول نافرمانی کا انتظام قایم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ہمیں غیر محدود ایثار و تحمل مصائب کیلئے پوری طرح کمربستہ رہنا چاہیئے، اور چونکہ تم
اتنا بھی نہیں ہو سکا ہے، جتنا ۱۹۲۱ء میں ہوا تھا، اسلئے نہیں کہا جاسکتا کہ قوم کس حد
برداشت کے لیئے تیار ہے۔ لیکن اگر ہم تعمیری کام آج پوری قوت کے ساتھ شروع کر
سول نافرمانی ہی خواب سے حقیقت بن جائیگی اور اسکے لیئے جو کمیٹی دہلی میں مقرر
ہے، وہ بلا تامل سرگرم کار ہو سکتی ہے۔ لیکن ایثار و قربانی سے گریز ہرگز نہ ہونا
اور اس گذارش کی ضرورت میں اُن حضرات کی خدمت میں خاص طور پر سمجھتا ہوں، جو
طلبی کے پاداش میں قید جیل چکے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ جیل ہو آنے کے بعد وہ اس
میں ہاتھ ڈالتے اس بنا پر جھجکتے ہیں کہ شاید ہمیں جیل جانا پڑے، تو میں عرض کرونگا کہ و
اس خدمت اسکے اہل نہیں۔ انکے لیئے جیل کی پہلی سزا یقیناً بیکار ثابت ہوئی انہیں تو م
میں ہاتھ نہ ڈالنا چاہیئے تھا، اور اگر ہاتھ ڈال ہی چکے تھے، تو سزا پاتے ہی انہیں فوراً
فدایان حکومت سے معافی مانگ لینی چاہیئے تھی۔ میں نے بیجاپور جیل میں کہا تھا ؎
بے گناہی سے بھی بڑھکر ہے اگر کوئی گناہ ٭ تو سزائے جرم پاکر خجلت تقصیر
میں نے آئندہ کام کیلیئے ایک بڑا مفصل نقشہ عمل آپکے سامنے کر دیا ہے۔ اگر آپ اسے
مذاق کے لحاظ سے پھیکا یا بے مزہ پائیں تو مجبوری ہے۔ آزادی کا راستہ پھولوں کے فر
بچھا ہوا نہیں ہے۔ جلد فوری منزل رسی کی صرف ایک ہی تدبیر ہے اور وہ یہ کہ موت گوارا
اور شکست گوارا نہ ہو۔ کسی مقصد عالی کے لیئے موت ہی ایسی چیز ہے، جو پہلے سے پہلے کھا

چٹپٹا اور ذائقہ دار بنا دیتی ہے۔ اور میں دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اگر ہماری ورکنگ کمیٹی (مجلس
کانگریس) کے ارکان اسکی محض رسمی قرارداد نہیں بلکہ واقعتہً دل سے اسکا تہیہ کرلیں کہ موت کے لئے
ی شروع کردینگے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ سوراج ایک سال کے اندر ملجاتا ہے۔ اور اگر کہیں آل انڈیا
میں اسکا عہد واثق کرلے تو میں کہتا ہوں کہ سوراج ایک سال نہیں ایک مہینہ کے اندر ملجانے کی چیز ہے
رائے عزیز دوستو اور رہنمایو کہیں ہم تم سب ملکر ملک کے لئے جان دینے پر تیار ہوجائیں تو سوراج
تا ہے۔ آج۔ لیکن اگر ہم اسکے لئے آمادہ نہیں اور پھر بھی بزدلی پر پروگرام کو ہلکا اور کمزور
ہیں تو کوئی حق نہیں کہ عقیدہ کانگریس میں تغیر کا نام تک زبان سے نکالیں۔ دوستو! کام کرینگے
نہ کرو، اور اگر ملک کی آزادی کی راہ میں ضرورت پیش آجائے تو جان تک سے دریغ نہ کرو۔ پھر اگر
ل بھر کے مخلصانہ جدوجہد کے بعد بھی گورنمنٹ ہمارے مقتید سردار کو رہا نہ کرے کہ وہ آکر اسکی
ن ما بات وکفارہ شمیدیات کا منظر دیکھے اور مستقبل کے لئے سوراج کا چارٹر حاصل کرے تو پھر
امل تردد ہمیں خدا کا نام لیکر "جمہوریہ ہند" یا آزاد اتحاد مذاہب کا علم بلند کردینا چاہئے اسوقت
ہمیں اپنے سابق صدرنشین کو برطانیہ سے رشتۂ وابستگی توڑنے میں کسی سے پیچھے نہ پائینگے ۱۹۲۱ء میں ہم نے
منٹ کو بھی ایک سال کی مہلت دی تھی اور اپنے کو بھی۔ لیکن معاہدہ کی شرائط اپنی طرف سے پورا کرنے
ہنے کوتاہی ہوئی۔ اسلئے اپنے ناتمام کام کی قیمت میں سوراج کا مطالبہ نہ کرسکے۔ آؤ ایکبار پھر پورا
نہ قدم اٹھائیں، اپنے خالق پر اعتماد کریں اور اسکے حضور میں گڑگڑائیں کہ ہمیں ہمت و دانش ثبات
ثقاہت کی توفیق عطا کرے، اور اس کام کی پھر از سر نو شروع کریں۔ جسکا نقشہ ہمارا سردار
ہمارے لئے کھینچ گیا ہے۔ اگر ہم اسکے اتباع کی کچھ بھی اہلیت رکھتے ہیں تو ہم اپنی آزادی گم شدہ
ل کرکے رہینگے، اور اسوقت یہ طور ایما کے نہیں بلکہ بہ طور شکرانہ فتح کے وہ قدیم و محبوب نعرہ
ائینگے۔

اللہ اکبر

مہاتما گاندھی کی جے